آزاد

تبرکاتِ آزاد

دربارِ اکبری۔ شہنشاہِ ہند جلال الدین محمد اکبر اور اُسکے نورتن کا تاریخی افسانہ دلچسپ حالات رزم، بزم۔ شادی وغم۔ ہندو مسلمان کا ملاپ اگر آپ مولانا کے قلمِ جواہر نگار سے لکھا ہُوا دیکھنا چاہیں۔ تو دربارِ اکبری منگائیں اصل میں یہ کتاب اِس عہد کی تاریخ ہے۔ یا یوں کہئے ۲۶×۲۰ کے ۸۵۰ صفحوں میں انشا پردازی کا گلشن کھل رہا ہے۔ قیمت پانچ روپے ۔ ۔ ۔ ۵ؔ

نگارستانِ فارس } یعنی فارسی زبان کے مشہور شعرا کا تذکرہ اور زبان فارسی کے عہد بعہد کی ترقیوں کو اُن کے کلام کے ساتھ ساتھ مؤرخانہ طرز لئے ہوئے آبحیات کے لفظوں میں خدائے سخن استاد رودکی سے لے کر خان آرزو تک کے حالات۔ یہ تصنیف آج تک بستوں میں لپٹی سو رہی تھی۔ اب خوش قسمتی سے نیا رہے۔ قیمت تین روپے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳ؔ

نیرنگ خیال۔ ہر دو حصص۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ ۔ ۔ عہ

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ۔ لاہور

آبِ حیات کے لطیفے

اور

شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم دہلوی کے مکمل

سوانح حیات

مرتبہ

آغا محمد اشرف صاحب ایم اے دہلوی ڈون اسکول ڈیرہ دون

برائے

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

بار اول ۱۹۳۹ء میں چھپی قیمت [illegible]

INSTRUCTIONS TO BOYS REGARDING SCHOOL-BOOKS.

1. School-books are the property of the Doon School.

2. Boys must sign in their form masters school book register for any book lent to them and taken out of the room.

3. Unless the *same* book, as shown by the number marked in the book, is returned before the end of the term, the cost of replacement may be charged on the boy's bill.

4. Boys may write their name and school number neatly on the first page but books returned with pictures or diagrams missing, or defaced in other ways, may be charged for on the bill.

5. Boys should at once examine books issued to them to see that they are in good condition; otherwise they may be held responsible for damage already done.

Dun Printing House, D Dun

دیباچہ

اُردو ادب میں جو شہرت اور ممتاز درجہ آبِ حیات کو حاصل ہے۔ اس کا مقابلہ کوئی اور کتاب شاید ہی کر سکے اب تک آبِ حیات کے بارہ ایڈیشن چھپ کر فروخت ہو چکے ہیں۔ مشکل سے کوئی ایسا گھر ملے گا کہ جہاں اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہو اور وہاں آبِ حیات یا اس کا انتخاب نہ ملے۔ ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کا اُردو نصاب اُس وقت تک مکمل نہیں کہلا سکتا۔ جب تک کہ اسمیں آبِ حیات یا اس کا کوئی حصّہ شامل نہ ہو۔

آبِ حیات کی اس عالمگیر مقبولیت کے ساتھ گذشتہ چند سالوں میں اس پر اکثر اعتراضوں کی بوچھاڑ بھی ہوئی ہے۔ میں ان اعتراضوں کا جواب دینے کی اسلئے ضرورت نہیں سمجھتا کہ حضرت آزاد نے اُردو ادب میں آبِ حیات

لکھ کر ایک نیا راستہ بنایا تھا۔ اور اُس وقت کی تحقیق کے مطابق اُنہیں جو کچھ بھی مواد ملا۔ اُسے نہایت نیک نیّتی سے کاغذ کے سینہ پر منتقل کر دیا۔ اس زمانہ میں نہ آج کل سے ذرائع آمد و رفت تھے کہ چند دنوں میں جہاں سے جی چاہا اور جو جی چاہا منگا لیا۔ نہ علم کی اسقدر سرپرستی تھی کہ تحقیق و تدقیق کے سہارے کوئی زندگی بسر کرے۔ آزاد نے وہ کام نبہا کیا جو آج بہت سے ادارے لاکھوں روپیہ خرچ کر کے بھی نہیں کر سکتے۔ بعض لوگوں نے مجھے مشورہ دیا کہ نئی تحقیق کے لحاظ سے جو باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ اُنہیں آبِ حیات میں شامل کر لیا جائے۔ لیکن میں آبِ حیات کو ایک کلاسیکل کتاب سمجھتا ہوں۔ جو ہمارے لئے ایک تبرّک ہے۔ اور اس میں ایک لفظ بھی بدلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ تحقیق کے دروازے کھُلے ہیں۔ اور ترقی کی راہیں ہمارے نوجوان ادیبوں کو صلائے عام دے رہی ہیں وہ نئی نئی باتیں معلوم کریں اور اپنی تحقیق سے اس میدان کو سرسبز بنا دیں۔ آبِ حیات سب کے لئے ایک مشعلِ ہدایت ہے۔ جس کی روشنی سے ایک مدت تک ہماری زبان

کی شاہراہ روشن رہے گی۔×

بعض دریدہ دہن اور بے باک نکتہ چینیوں نے تحقیق کے پردے میں آزاد کی نیت پر حملہ کیا۔ لیکن میرے نزدیک یہ اُن کی سراسر بے انصافی ہے۔ دُنیا میں بے عیب ذات کس کی ہے۔ اور تحقیق کا دروازہ دُنیا میں کب بند ہوا ہے۔ کیا عجب ہے کہ وہ لوگ جو آج اپنی تحقیق کے سرمایہ پر نازاں ہیں۔ کل کچھ اور لوگ ایسی باتیں معلوم کریں کہ ان کے خیالات فرسودہ اور بیکار ثابت ہو جائیں۔ بس اسی معیار پر آبِ حیات کو جانچیئے۔ ادب میں تعصب اور فرقہ پرستی کا کیا کام۔ قبولیت عام تو ایک نعمت ہے کہ جس کو چاہے خُدا روزی فرما دے۔ آزاد کے قلم میں قدرت نے وہ زور و ولیعت کیا تھا۔ کہ جو ان کے بعد پھر کسی اور کو نصیب نہیں ہوُا۔ بے جا حملے اور سفیہانہ نکتہ چینیاں آزاد کی شہرت اور آبِ حیات کی قدر و منزلت کو نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ بلکہ وہی لوگ جو آبِ حیات پر اعتراض کرتے ہیں۔ اس کی مدد کے بغیر ایک لفظ نہیں لکھ سکتے۔ اور جن واقعات کو زیبِ داستان حکایتیں کہہ کر غلط ثابت

کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ خود بھی انہی حکایتوں کو بلکہ آزاد کے لفظوں کو دُہرا کر اپنی تصانیف کی قدر و منزلت بڑھاتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ آبِ حیات کے لطیفے اور اسکی روایتیں اردو ادب کی تعمیر میں ایک ایسی بنیاد ہیں کہ جس پر ہماری زبان کی عمارت بنی ہے۔ آبِ حیات کے فقرے اور لطیفے اب ضرب المثل بن کر گھر گھر زبانِ زد خاص و عام ہیں اب تک ہماری زبان کے بندی اِن جواہر پاروں کو صرف آبِ حیات ہی میں پڑھ سکتے تھے۔ جو شعراء کے حالات میں اسطرح لپٹے ہوئے تھا کہ انہیں اصل متن سے الگ کرنا گویا گوشت سے ناخن کو جُدا کرنا تھا۔ میرے چند دوستوں اور اردو کے ادب شناسوں نے مشورہ دیا کہ اِن ادبی حکایتوں اور لطیفوں کو بندیوں کے لئے ایک کتاب کی صورت میں الگ چھاپ دیا جائے تو یہ زبان بھی سکھا ئیں گے اور ہماری زبان کی تاریخ سے بھی روشناس کرا دینگے۔ اِن حضرات کا مشورہ مجھے پسند آیا۔ اور اب اِن ادبی جواہر پاروں کو ایک کتاب کی شکل میں چھپایا جا رہا ہے۔ تاکہ

مبتدی بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

اب تک آزاد مرحوم کے مکمل سوانح ایک جگہ نہیں چھپے اگرچہ مختلف رسالوں اور تذکروں میں ضمناً ان کا ذکر آ گیا ہے۔ لیکن مکمل حالات ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتے۔ اس سلسلہ میں حضرت آزاد کے اکثر مدّاح مجھ سے استفسار فرماتے ہیں۔ اور ان کو فرداً فرداً جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے حسنِ اتفاق سے دسمبر ۱۹۳۸ء میں ادارۂ معارف اسلامیہ کا سالانہ جلسہ دہلی میں منعقد ہوا۔ اور اس میں شرکت کی غرض سے جناب پروفیسر محمد شفیع صاحب پرنسپل اورنٹیل کالج پنجاب یونیورسٹی اور پروفیسر محمد اقبال صاحب لاہور سے تشریف لائے۔ ان حضرات نے برادر مکرم جناب آغا محمد باقر صاحب ایم۔ اے سے فرمائش کی کہ مولانا کے حالات ایک جگہ جمع کر دیں۔ اور برادر موصوف نے چند روز کی لگاتار کوششوں کے بعد متفرق یادداشتوں۔ خاندانی روایتوں اور مختلف ذرائع سے آزاد کے حالات ایک جگہ مضمون کی شکل میں جمع کر کے پرنسپل صاحب کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ جو انہوں نے اورنٹیل کالج میگزین کے ضمیمہ بابت ماہ فروری ۱۹۳۹ء

ہیں چھاپ دیجئے۔ مجھے خیال آیا کہ ضمیمہ بھی ضمیمہ ہے۔ اگر
یہ حالات آبِ حیات کے لطیفوں کے ساتھ چھپ جائیں
تو شاید آزاد کے پرستاروں کی ایک حد تک پیاس بجھا
سکیں۔ چنانچہ پرنسپل صاحب بالقابہ کی اجازت سے اب
یہ حالات آبِ حیات کے لطیفوں کے ساتھ چھاپ رہا ہوں۔
افسوس یہ ہے کہ جس باکمال انشا پرداز نے اردو کے
شاعروں اور ادیبوں کو حیاتِ جاوید بخشی اسکے حالات
اور سوانح اب تک گوشۂ گمنامی میں پڑے رہے۔ اور پھر
جس شان سے چھپنے کے مستحق ہیں اُس کے لئے آزاد ہی
کا سا سحر آفریں قلم درکار ہے۔ تاہم جو مواد اب ایک
جگہ جمع ہو گیا ہے۔ وہ اس سے پہلے کبھی مرتب نہیں ہوا
تھا۔ اور خطرہ تھا کہ امتدادِ زمانہ سے کہیں یہ حالات
بھی اسقدر محو نہ ہو جائیں کہ ان کی چھان بین کے لئے تحقیق
کے گھوڑے دوڑانے پڑیں۔

ہمارے ملک میں جب سے ادبی بیداری کے آثار پیدا
ہوئے ہیں۔ اکثر حضرات نے اس میدان میں بہت سی بارآور
کوششیں کی ہیں۔ چنانچہ ابھی سال عثمانیہ یونیورسٹی سے

ایک خاتون نے حضرت آزاد پر ایک نہایت محققانہ مقالہ تحریر کیا ہے۔ اور ایک دوسرے صاحب ناگپور یونیورسٹی میں اس موضوع پر پی۔ایچ ڈی کے لئے اپنا مقالہ تیار کر رہے ہیں۔ ایسے حضرات کے لئے یہ سوانح بہت مفید ثابت ہونگے ۔

محمد اشرف

ڈون اسکول۔ ڈیرہ ڈون
۸ مئی ۱۹۶۹ء

شمس العلما

مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم دہلوی

کے مکمّل

سوانح حیات

از

آغا محمد باقر صاحب ایم۔ اے

مولانا آزاد کی آخری تصویر
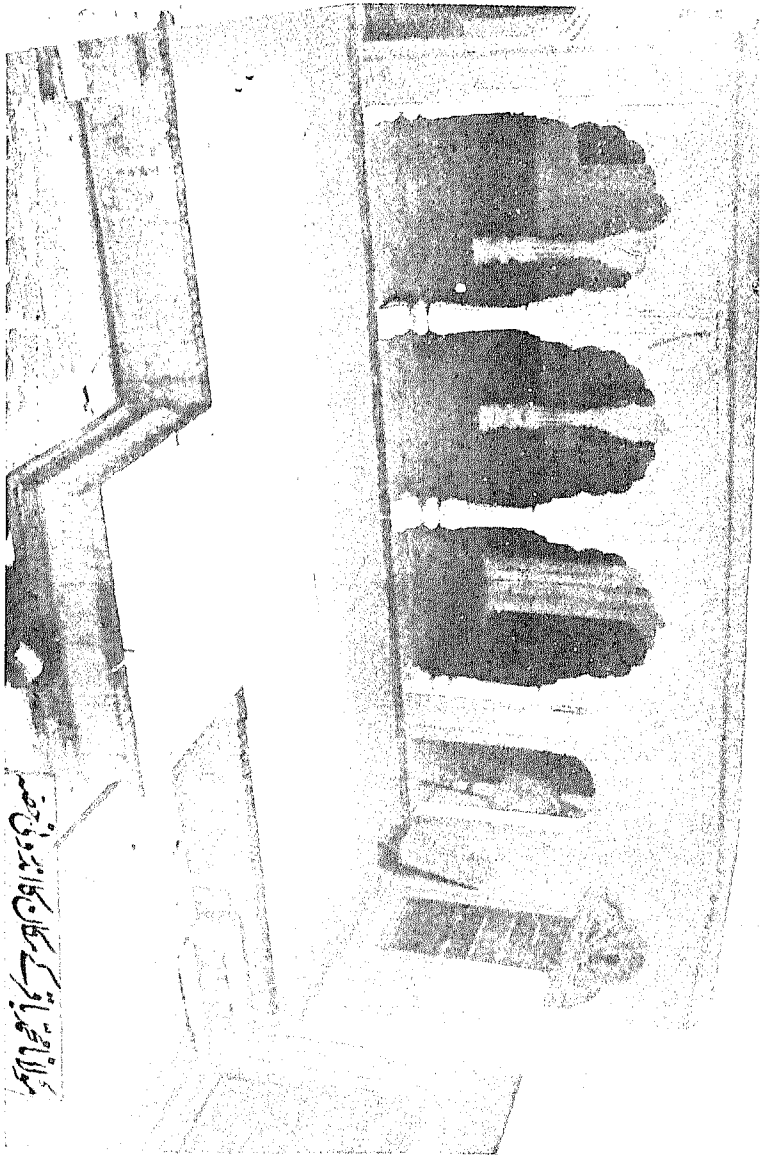
مولانا محمد باقر کے مکان کا اندرونی حصہ

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد

آزاد کا اصلی وطن دہلی تھا۔ جہاں ۱۸۳۰ء میں ان کی ولادت ہوئی۔ خاقانی ہند استاذ ذوق مرحوم نے "ظہور اقبال" تاریخ پیدائش کہی۔ ان کے بزرگ مولانا محمد شکوہ شاہِ عالم کے دورِ حکومت میں ہمدان سے دہلی آئے۔ وہ علوم متداولہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اور علوم مذہبی کی اسناد ان کی کلاہِ فضیلت کا طرۂ امتیاز تھیں۔ دربار سے ان کو کچھ وظیفہ بھی ملتا تھا۔ تھوڑی سی مدت میں مولانا نے مرحوم کی مذہبی واقفیت اور اجتہاد کا سکہ عوام کے دلوں پر بیٹھ گیا اور وہ مذہبی پیشوا اور مجتہد تسلیم کر لئے گئے۔

خاندان

مولانا محمد شکوہ کی زوجہ محترمہ بھی ایران سے ان کے ساتھ آئی تھیں۔ مولانا نے اپنے فرزند محمد اشرف کو علوم دینیہ کی خود تعلیم دی اور ان کے انتقال کے بعد وہ ان کے جانشین ہوئے اور مجتہد کہلائے۔ مولانا محمد اشرف کی شادی بھی ایران میں ہوئی۔ اسی طرح یہ بھی اپنے صاحبزادے محمد اکبر کی شادی ایران سے کر کے لائے۔ مولانا محمد اکبر بھی اپنے والد کے بعد مجتہد اور عالم دین ہوئے۔ یہ بات ابھی تک مشہور ہے۔ کہ مولانا محمد اکبر صحیح اُردو نہ بول سکتے تھے۔ آبِ حیات میں لکھا ہے کہ " آزاد ہندی نہاد کے بزرگ فارسی کو اپنی تیغ زبان کا جوہر جانتے تھے۔ مگر تخمیناً سو برس سے کل خاندان کی زبان اُردو ہے " آبِ حیات پہلی مرتبہ ۱۸۸۱ء میں چھپی تھی۔ اس بیان کے مطابق اس خاندان کی تیسری پشت کی زبان اُردو ہوگئی۔ یہ بالکل ممکن ہے۔ کہ تمام خاندان کی زبان اس وقت تک اُردو ہوگئی ہو۔ لیکن

مولانا محمد اکبر پر فارسی زبان کے اثرات باقی ہوں۔ ایسا ہونا قرینِ قیاس بھی ہے۔ کہ اس وقت تک سلسلۂ ازدواج ایران سے رہتا تھا۔ مولانا محمد اکبر نے اس رسم کو پہلی مرتبہ توڑا۔ اور اپنے صاحبزادے محمدؐ باقر کی شادی دہلی کے ایک ایرانی نژاد خاندان میں کی۔ جس سے محمد حسین پیدا ہوئے ❊

مولانا محمدؐ اکبر کا مدرسہ

مولانا محمد اکبر اپنے وقت میں ایک عالم متبحّر شمار ہوتے تھے۔ علوم دینیہ کی درس وتدریس کے لئے اُنہوں نے ایک مدرسہ بھی جاری کر رکھا تھا۔ جو شمالی ہندوستان میں بہت اچھی شہرت رکھتا تھا۔ چنانچہ علوم دینیہ کے پیاسے دُور دُور سے آکر سیراب ہوتے تھے۔ اس مدرسہ میں فقہ وتفسیر کی تعلیم دی جاتی۔ مولوی محمد باقر نے بھی اسی مدرسے میں تعلیم پائی۔ اِس خاندان کا ایک یہ دستور چلا آتا تھا کہ باپ اپنے علوم کے خزانے بیٹے کے سپرد کرتا اور باپ کے بعد بیٹا ہی جانشین ہوتا ❊

مولانا محمد باقر

آبِ حیات میں شیخ ابراہیم ذوقؔ کے حالات میں مذکور ہے۔ کہ مولوی محمد باقر اور شیخ ابراہیم ذوقؔ نے ایک ہی اُستاد کے دامنِ شفقت[1] میں تعلیم پائی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا محمد اکبر اپنے فرزند کو اپنے مدرسے کی مخصوص تعلیم کے علاوہ دیگر علوم سے بھی بہرہ ور کرنے کے خواہشمند تھے۔ اور یہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا تمام علوم متداولہ میں دستگاہ پیدا کرے۔ چنانچہ مولوی محمد باقر اپنے شفیق باپ کی زندگی میں اس مدرسے میں درس بھی دینے لگے تھے۔ سید رجب علی صاحب جو جگراؤں ضلع لدھیانہ کے رہنے والے تھے۔ اور غدر دہلی کے بعد سرکاری خدمات کے صلے میں ارسطو جاہ اور خان بہادر ہو کر گورنر پنجاب کے میر منشی ہوئے اسی مدرسہ کے طالب[2] علم تھے۔ ان کے علاوہ قاری جعفر علی صاحب جو

---

[1] ذوقؔ حافظ غلام رسول شوقؔ کی مسجد سے میاں عبدالرزاق کے درس میں جا پہنچے۔ میاں صاحب دہلی کے مشہور فاضل تھے۔ اور کابلی دروازے میں درس دیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کی وہیں ذوقؔ سے ملاقات ہوئی۔

[2] مولوی رجب علی کو ارسطو جاہ کا خطاب ۱۸۷۵ء میں ملا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۵۰ سال کی تھی ۱۸۶۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ۱۸۲۲ء میں وہ دہلی کالج میں زیرِ تعلیم تھے (دیکھو رسالہ پنجاب)

علم حاصل کر چکے تھے

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اجتہاد کے رتبے کو پہنچے۔ وہ مولانا محمد اکبر ہی کے شاگرد رشید اور انہی کے مدرسے کے قابلِ فخر طالب علم تھے۔

باقری اور جعفری

مولانا محمد باقر نے منقول و معقول کی تحصیل کے بعد حکومت کی ملازمت اختیار کی۔ اور تحصیلدار مقرر ہوئے۔ چونکہ مولانا محمد اکبر اپنے خاندان کو دینی عزت یعنی مجتہدی سے سربلند رکھنا باعث فخر خیال کرتے تھے۔ اسلئے انہوں نے کچھ مدت کے بعد ملازمت سے استعفاء لواکر اپنا جانشین بنا دیا۔ لیکن مولانا محمد اکبر کے انتقال کے بعد دہلی میں دو جماعتیں پیدا ہو گئیں۔ ایک جماعت قاری جعفر علی کی معتقد تھی جو مولانا محمد اکبر اور مولوی محمد باقر دونوں کے شاگرد تھے اور دوسری جماعت مولانا محمد باقر سے عقیدت رکھتی تھی۔ اس سے پہلے اجتہاد کا درجہ محض مولانا محمد باقر کے خاندان سے مخصوص تھا لیکن قاری جعفر علی صاحب کے دہلی میں قیام کرنے سے یہ قدیمی اعزاز

منقسم ہوگیا۔ اس افتراق کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے۔ کہ نواب حامد علی خاں مرحوم نے تقریباً بیس ہزار روپیہ نذرانہ دے کر سلطنت مغلیہ کی مختاری کا عہدہ حاصل کیا۔ اب انہیں اپنی پارٹی کو تقویت دینے کے لئے ایک عالمِ دین کی ضرورت لاحق ہوئی۔ قاری جعفر علی صاحب جو نواب صاحب موصوف کی تحریک اور سفارش سے مولانا محمد اکبر مرحوم کے مدرسے میں تحصیلِ علومِ دینیہ کے لئے داخل ہوئے تھے۔ اسوقت ضروری اسناد حاصل کر چکے تھے۔ نواب صاحب نے اپنی سرپرستی اور اعانت کا پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ اور اب ان جعفر علی صاحب کو مولانا محمد باقر کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ اس طرزِ عمل اور دراندازی سے دہلی کی شیعہ جماعت میں نفاق پیدا ہوگیا۔ اور وہی گروہ جو مدتوں سے ایک ہی خاندان کے ساتھ عقیدت رکھتا چلا آتا تھا۔ دو جماعتوں میں تقسیم ہوگیا۔

مولانا محمد باقر اور قاری جعفر علی صاحب کے درمیان چند فقہی مسائل پر اختلاف بھی تھا۔ اس کے متعلق بعض اوقات مناظرے اور مکالمے بھی ہوتے۔ اور اکثر مجادلوں تک نوبت

پہنچتی تھی۔ اسی زمانے کا ایک رسالہ میرے پاس محفوظ ہے۔
جو مولانا محمد باقر کی طرفداری میں مولوی رجب علی شاہ صاحب
نے شائع کیا تھا۔ وہ اس رسالے کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ
مولانا محمد باقر میرے اُستاد ہیں اور بحیثیت شاگرد ہونے کے
میرا فرض ہے۔ کہ میں ان اعتراضات کا دندان شکن جواب
دُوں جو مولانائے موصوف کے بعض عقاید پر کئے جاتے ہیں۔

اس مختصر سے مضمون میں ان متنازعہ فیہ مسائل پر بحث
کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہمارا مدعا صرف اسقدر عرض
کرنا ہے کہ ایک متحد اور متفق جماعت میں مذہب کے نام پر ایسی
نااتفاقیاں پیدا ہوئیں۔ جو بڑھتے بڑھتے نہایت ناگوار صورت
اختیار کر گئیں۔ اور غدر کے ہنگامہ میں ان کا پورا پورا اثر ظاہر
ہوُا۔ یعنی یہ کہ مولانا محمد باقر کے خاندان کا چراغ بجھتے بجھتے رہ گیا۔

یہ دونوں جماعتیں اپنے پیشواؤں کے ناموں کی رعایت سے
جعفری اور باقری کہلاتی تھیں۔ اگرچہ ان کے طرفداروں کے
بے جا اعتراضوں سے اکثر جھگڑے فساد برپا ہوتے۔ لیکن مولانا
محمد باقر اور قاری جعفر علی صاحب ہمیشہ بہت محبت اور خلوص
سے ملتے۔ اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ آتا۔ مولانا محمد باقر

کو اگر ایک طرف اپنے قابل باپ کے جانشین ہونے کا فخر تھا۔ تو دوسری طرف ان کی ذاتی قابلیت بھی اپنے شاگردوں سے کم نہ تھی۔ مگر قاری صاحب کی شخصیت سراسر نواب حامد علی خاں کے دبدبے کی مرہونِ احسان تھی۔ جو اس وقت سلطنتِ مغلیہ کے مختارِ کُل تھے۔ اور شہر بھر میں ان کا طوطی بولتا تھا۔

ان دونوں گروہوں کی مخالفت روز بروز ترقی پر تھی۔ معاندانہ رسالوں کی اشاعت ہوتی اور مذہبی جلسوں میں تکرار کی نوبت پہنچ جاتی۔ چنانچہ معاملات اس حد کو پہنچے کہ ایک دن رات کی تاریکی میں کسی تاریک دل جعفری نے مولانا محمد باقر کے مکان کی ڈیوڑھی پر آکر دستک دی۔ ڈیوڑھی میں کڑوے تیل کا چراغ روشن تھا۔ اس ملعون نے اسے ٹھنڈا کر دیا۔ مولانا نے جونہی ڈیوڑھی میں قدم رکھا۔ اس نامعلوم دشمن نے ایک دم چھری سے سات کاری زخم لگائے۔ مولانا سخت مجروح ہوتے اور بیہوش ہوکر گر پڑے۔ حملہ آور اپنا کام کرکے رات کی تاریکی میں غائب ہوگیا۔ قدرت کو جان بچانی منظور تھی۔ تھوڑی مدت میں وہ کاری زخم مندمل ہوگئے۔ اور اس حادثے سے جعفری اور باقری گروہ کی الجھنیں زیادہ بڑھ گئیں۔

کہا جاتا ہے۔ کہ باقری گروہ تعداد میں زیادہ تھا۔ لیکن اس کے ممبر بدترین حالات میں بھی صبر کا دامن اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑتے تھے۔ اور یہ ان کے قائد کی تعلیم تھی۔ چنانچہ یہ مصرعہ ابھی تک پرانے لوگوں کی زبانی سنا جاتا ہے ع

جعفری کہلائیں ہیں اور باقری سے بغض ہے

مصرعہ ہذا میں اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ امام باقر علیہ السلام امام جعفر علیہ السلام کے والد بزرگوار تھے۔ اسلئے ان کے پیروں کو یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی کہ اپنے امام کے بزرگوار کو برا کہیں دوسرے اس میں یہ رمز بھی ہے۔ کہ قاری جعفر علی مولانا محمد اکبر کے شاگرد تھے اسلئے قاری صاحب کے عقیدتمندوں کے لئے یہ بات مناسب نہیں کہ وہ اس شخص کے درپے آزار ہوں۔ جس کے والد بزرگوار سے ان کے قائد نے علوم دینیہ کی تحصیل کی ہے۔ اور پھر ان کے بھی شاگرد رہیں۔

آزاد کا دہلی کالج میں داخلہ

انہی دنوں دہلی کالج بہت اوج پر تھا۔ مسٹر ٹیلر اس کے

پرنسپل تھے۔ اس مدرسے کی بڑی خوبی یہ تھی۔ کہ اس میں علوم دینیہ کی تدریس کے ساتھ ساتھ علوم متداولہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ مسٹر ٹیلر کی نگرانی میں انگریزی۔ ریاضی۔ جغرافیہ اور سائنس کی تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ قاری جعفر علی صاحب اس کالج میں شیعہ دینیات کے معلم تھے۔

خاندانی رواج کے مطابق مولانا محمد باقر نے اپنے فرزند محمد حسین کو پہلے اپنی نگرانی میں علوم دینیہ کے منازل طے کرائے۔ پھر مسٹر ٹیلر کے کہنے سننے سے اُنہیں دہلی کالج میں داخل کر دیا۔ تاکہ معقولات میں بھی دستگاہ پیدا کرلیں۔ محمد حسین شروع ہی سے بڑے ہونہار تھے۔ مسٹر ٹیلر کی سرپرستی بھی ان کو حاصل تھی جو مولانا محمد باقر کے بہت گہرے دوست تھے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی۔ کہ مولانا نے مرحوم تعلیم و تعلم سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ اس زمانے میں یہ بالکل عجیب سی بات تھی۔ کہ ایک انگریز افسر کسی ہندوستانی کا گہرا دوست ہو اور وہ بھی مولوی کا۔ اس عہد میں انگریز سے چھو جانا نجس ہو جانے کے مراوف تھا۔ لیکن باوجود اس قسم کے توہمات کے مولانا محمد باقر اور مسٹر ٹیلر میں گاڑھی چھنتی تھی۔ اور شب و روز ملنا جلنا رہتا۔ بات یہ ہے۔ کہ مولانا محمد باقر بڑے مرنجاں مرنج، ہر دل عزیز اور غیر متعصب

شخص تھے۔ وہ اگرچہ مجتہدوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔
اور خود بھی مجتہد تھے۔ لیکن ان کے خیالات عام علماء کی طرح
محدود نہ تھے۔ روشن خیالی اور بے تعصبی نے ان کی شخصیت کو
عام علماء کے معیار سے بہت بلند بلکہ بلند تر کر دیا تھا۔ تنگ خیال
مخالف گروہ انہی خصوصیات پر خصومت کے جذبے کو بھڑکاتا تھا۔

آزاد کا قاری جعفر علی سے مقابلہ اور سُنّی جماعت میں داخلہ

جب محمد حسین کالج میں داخل ہوئے۔ تو ان کو بھی قاری
جعفر علی صاحب کی جماعت میں حاضر ہونا پڑا۔ مولانا محمد باقر
مولوی صاحب کی کمزوریوں اور ان کے مبلغ علم سے کما حقہٗ واقف
تھے۔ کہ وہ انہی کے مدرسے کے فارغ التحصیل تھے۔ لوگ کہتے
ہیں کہ وہ خود کبھی قاری صاحب سے دو بدو نہیں ہوئے
ان کے شاگرد ہمیشہ ان کے اعتراضات کے جواب دیا کرتے
تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے صاحبزادے یعنی قاری صاحب

کے نئے شاگرد کو پوری طرح تیار کر دیا۔ محمد حسین قاری صاحب کی تقاریر پر ہر روز نئے سے نئے اعتراض کرتے اور اپنے اُستاد کو عاجز کر دیتے۔ جب ان قصوں نے بہت طول پکڑا تو قاری صاحب تنگ آ گئے اور سمجھ گئے کہ شاگرد کے پردے میں کوئی اور بول رہا ہے۔ جب کچھ بن نہ آئی تو پرنسپل سے شکایت کی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ محمد حسین صاحب کو فقہ شیعی کی جماعت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اور یہ فیصلہ ہُوا کہ وہ سُنی فقہ کی جماعت میں شامل ہُوا کریں۔ فقہ سُنی کے پروفیسر دہلی کے مشہور عالم مولوی سید محمد صاحب تھے۔ وہ بڑے روشن خیال اور پائے کے عالم تھے۔ اُنھوں نے بہت خوشی سے اپنی جماعت میں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ پہلے ہی دن مولوی صاحب نے اپنے نئے شاگرد سے کہا کہ ہم نے سُنا ہے تم مباحثہ خوب کرتے ہو۔ بھلا آج فلاں بحث پر ہمارے سامنے تقریر تو کرو۔ ہم بھی دیکھیں قاری جعفر علی صاحب تم سے اتنے نالاں کیوں ہیں؟ محمد حسین نے حکم کی تعمیل کی اور ایسی شستہ اور برجستہ تقریر کی کہ مولانا سید محمد پھڑک اُٹھے۔ اُٹھ کر سینے سے لگا لیا اور کہنے لگے " ایسے ذہین اور ہوشیار انسان تو النادر کالمعدوم کا مصداق ہیں۔ صدیوں میں جا کر کہیں ایک دو آدمی

ایسے پیدا ہوتے ہیں۔ محمد حسین تم خاطر جمع رکھو۔ ہم تمہیں پڑھائینگے اور خاص توجہ سے پڑھائیں گے۔"

چنانچہ محمد حسین نے سُنی دینیات کی تکمیل مولانا سید محمد صاحب کی سرپرستی میں کی۔ ان ناگوار واقعات سے خاندان کو جو کچھ نقصان پہنچنا تھا وہ پہنچکر ہی رہا۔ لیکن اتنی بات ضرور ہوئی کہ محمد حسین شیعہ سُنی دونوں مذہبوں سے پوری طرح واقف ہو گئے۔ اور اسلام کے ان دو اہم فرقوں کی خوبیاں ان کے دل پر روز روشن کی طرح ظاہر ہو گئیں۔ جن کی رہنمائی میں انہوں نے اپنے لئے ایک ایسا راستہ تلاش کر لیا جو تعصب اور تنگدلی کے کانٹوں سے پاک تھا۔

محمد حسین اپنے ہمعصروں میں بہت ہی ذہین اور طباع تھے۔ اور مضامین کے علاوہ مضمون نویسی اور انشاپردازی میں ہمیشہ سب سے سبقت لے جاتے تھے۔ اس کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ ان کو مضمون نگاری کی شروع سے مشق تھی۔ گھر سے اردو اخبار

نکلتا تھا۔ اور ان کے والد بھی شمالی ہندوستان میں مضمون نویسی کے اعتبار سے خاص شہرت رکھتے تھے۔ اسلئے ان کے خیالات اپنے ہمعصروں میں بہت زیادہ بلند تھے۔ اسی زمانے میں ایک مرتبہ ڈاکٹر سویٹ صاحب کمشنر مدارس کلکتہ سے تشریف لائے اور اُنہوں نے کالج کا معائنہ کیا۔ اور ہر جماعت کا جزدی سا امتحان لے کر ہر طالب علم سے فرداً فرداً پوچھا۔ کہ تم تعلیم سے فارغ ہوکر کیا کروگے؟ ہر ایک نے اپنا اپنا خیال اور ارادہ ظاہر کیا۔ اسی سلسلہ میں محمد حسین کی بھی باری آئی۔ اُنہوں نے کہا "میں تحصیل علوم کروں گا۔ اور جو خیالات ہیں اور ہوں گے۔ انھیں اپنے اہلِ وطن میں پھیلاؤں گا" خدا کی قدرت ہے۔ کہ آزاد پر ہزاروں انقلاب گزرے۔ مگر وہ ارادہ بدستور قائم رہا۔

دہلی کالج کی تعلیم و تربیت سے محمد حسین کی اعتقادی دنیا پر پہلا انقلاب گزرا۔ خاندانی خصوصیت یعنی اجتہاد کو کہ بڑے سے بڑے رتبے کا ہمپایہ تھا۔ اپنے دل سے نکال دیا اور پختہ ارادہ کرلیا۔ کہ مذہبی تعصب سے بالا ہوکر ملک اور قوم کی خدمت کروں گا۔ ان کے عقاید اگرچہ مرتے دم تک شیعی تھے۔ لیکن کسی قسم کے تعصب یا تنگدلی کو اس میں دخل نہ تھا ٭

مولانا محمد باقر کی ادبی دلچسپیاں

مولانا محمد باقر اگرچہ مجتہد تھے۔ لیکن ان کی افتاد طبع نہایت شاعرانہ واقع ہوئی تھی۔ اور شاعری سے ان کو بے حد دلچسپی تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ خود بھی شعر کہا کرتے تھے۔ ہمارے مولویوں کو عام طور پر شاعری سے جبلّی نفرت ہوتی ہے۔ وہ شاعروں کو بے دھڑک یاوہ گو کہتے ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں شاعر اپنے آپ کو تلامیذ الرحمٰن کہہ کر اپنا دل ٹھنڈا کرتے ہیں۔ لیکن مولانا محمد باقر اس قسم کے مولوی نہ تھے۔ وہ ایک خوش مزاج اور متین شخص تھے اور اپنے پہلو میں ایک غیر متعصّب دل رکھتے تھے۔ چنانچہ شیخ ابراہیم ذوق سے ان کو بڑی ارادت تھی۔ کیوں نہ ہو۔ آخر بچپن کے ساتھی تھے۔ ایک ہی اُستاد کے شاگرد اور ہم سن تھے۔ بچپن کے رابطے عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ مضبوط اور پائدار ہوتے گئے۔

مولانا محمد باقر اور شیخ ابراہیم ذوق کا اتحاد ان کی زندگیوں کے آخری دم تک قائم رہا۔ اور اس میں کسی قسم کا فرق نہ آنے

پایا۔ ذوقؔ مرحوم کو اپنے عزیز دوست سے اس قدر محبت تھی کہ وہ ان پر پورا پورا بھروسہ رکھتے تھے اور اپنا کلام ہمیشہ انہی کے پاس جمع کراتے۔ ادھر مولانا بھی ان کے کلام کے اسقدر عاشق تھے۔ کہ باوجود علمی اور منصبی کاروبار میں منہمک ہونے کے وہ ذوقؔ کے کلام کو صاف کرکر کے حفاظت سے اپنے پاس رکھتے جاتے۔ چنانچہ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک رجسٹر ابھی تک ہمارے پاس محفوظ ہے۔ کہ اس میں ذوقؔ مرحوم کا کلام مندرج ہے۔ یہ آج سے سو سال پہلے کی یادگار اس بات کا زندہ ثبوت ہے۔ کہ مولانا محمد باقرؔ اگرچہ مولوی بلکہ مجتہد تھے۔ لیکن اپنے پیارے دوست کے فرزندانِ روحانی کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ مولانا محمد باقرؔ کا ادبی شوق اس امر سے بھی ظاہر ہے۔ کہ انہوں نے اُردو کا سب سے پہلا اخبار ۱۸۳۶ء میں "اُردو اخبار" کے نام سے جاری کیا تھا۔ یہ اخبار بالکل ادبی شان کا پرچہ تھا۔ اس میں ذوقؔ۔ غالبؔ۔ مومنؔ اور دیگر معاصرین کا کلام بھی شائع ہوا کرتا۔ کبھی کبھی زبان اور محاورات پر بھی بحث ہوتی اُستاد ذوقؔ کی تاریخہائے وفات اور شہیدؔی مرحوم کی شاعری پر ادبی مباحثہ اسی اخبار میں مدتوں چھپا کیا۔

اس کے علاوہ وہ نایاب قلمی کتابوں کے کتب خانے کے بھی مالک تھے۔ جو ہنگامۂ غدر میں تباہ ہوگیا۔ ایک پریس بھی ان کی اپنی ملکیت تھا، جس میں ان کا اخبار اور کتابیں وغیرہ ان کی اپنی نگرانی میں چھپا کرتی تھیں۔

آزاد کا اُستاد ذوقؔ سے تلمذ

مولانا محمد باقر نے اپنے لڑکے محمد حسین کو بچپن ہی سے ذوقؔ کے سپرد کر دیا۔ اُستاد ذوقؔ نے محمد حسین کو آزادؔ کا تخلص دیا۔ آزاد تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اُستاد کی خدمت میں حاضر رہتے۔ وہ بھی جہاں کہیں جاتے آزاد کو اپنے ساتھ لے جاتے۔ چنانچہ اس زمانے کے ہر مشاعرے اور جلسے میں یہ ان کے ساتھ رہتے۔ اُستاد ذوقؔ آزاد کے حال پر کمال شفقت فرماتے اور اپنے علم و فضل کے خزانے بے دریغ اپنے عزیز شاگرد کو عطا کرتے۔ آزادؔ اسی طرح بیس اکیس برس ان کے ظاہری اور باطنی فیوض سے مستفیض ہوتے رہے۔ اصلاحِ سخن، شعر و شاعری، معرکے اور معاملے غرض تمام اُن کی آنکھوں کے سامنے

گزرے اور جو حالات کہ بچشم خود نہ دیکھے تھے۔ وہ اس طرح سنتے تھے۔ گویا ان کے سامنے ہی واقع ہوئے ہیں۔ آزاد کو اپنے استاد کا بیشتر کلام زبانی یاد ہو گیا تھا۔ غرض اس مصدر فیوض کے فیض سے آزاد کی قابلیت اور طبیعت نے غیر فانی روشنی حاصل کی تھی ؎

حکیم آغا جان عیش سے مشورۂ سخن

حکیم[1] صاحب بادشاہی اور خاندانی طبیب تھے۔ زیورِ علم اور لباسِ کمال سے آراستہ۔ صاحبِ اخلاق۔ خوش مزاج شیریں کلام شگفتہ صورت۔ جب دیکھو یہی معلوم ہوتا تھا کہ مسکرا رہے ہیں۔ اسکے ساتھ ان کو شعر کا بھی عشق تھا۔ طبیعت ایسی ظرافیت لطیف اور بذلہ سنج پائی تھی۔ کہ جسے شاعری کی جان کہتے ہیں غزل صفائی کلام۔ شوخیٔ مضامین اور حسن محاورہ سے موتیوں کی لڑی ہوئی تھی۔ اور زبان گویا پھولوں کی پھلجھڑی۔ آزاد نے

[1] دیکھو آب حیات۔ استاد ذوق کے حالات میں ۱۲

ان کو دو مرتبہ اُستاد ذوقؔ کے ساتھ مشاعرے میں دیکھا تھا۔میانہ
قد۔خوش اندام۔سر پہ ایک اُنگل سفید بال۔ایسی ہی ڈاڑھی گوری
سُرخ رنگت پر بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔گلے میں ململ کا کُرتہ
جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔آزادؔ اُن دنوں دہلی
کالج میں پڑھتے تھے۔

اُستاد ذوقؔ کے انتقال کے بعد آزادؔ کو ذوقِ سخن اور
ان کے کمالات کی کشش نے حکیم صاحب کی خدمت میں پہنچایا
اور یہ مشورۂ سخن غدر ۱۸۵۷ء تک گویا محض ڈھائی تین سال
جاری رہا۔ان بزرگ نے غدر کے چند روز بعد اس دُنیا سے
انتقال کیا ؛

مولانا محمدؐ باقر کی اولاد

مولانا محمد باقر کی پہلی شادی ایران کے ایک نجیب الطرفین
خاندان کی لڑکی سے ہوئی۔یہ خاندان بھی علم و فضل اور دنیا وی
دولت سے خوب بہرہ ور تھا۔اس بیوی سے محمد حسین اور دو
لڑکیاں ہوئیں۔پہلی بیوی کے انتقال کے بعد انہوں نے کئی

سال شادی نہ کی اور نہ دوسری شادی کرنے کا ارادہ تھا۔ بیمار ہوئے تو حکیم نے مشورہ دیا کہ آپ شادی کرلیں۔ دوسری شادی ماسٹر حسینی کی بہن سے ہوئی۔ وہ دہلی کالج کے باکمال اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ کچھ مدت بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ تیسرا عقد انہوں نے اپنی ایک خانہ زاد سے کیا۔ یہ مخدرہ غدر کے بعد مدتوں زندہ رہیں۔ آخری دو بیویوں سے کوئی اولاد نہیں ہوئی ⁂

مولانا محمد باقر کی جائداد

مولانا محمد باقر (دہلی میں) کشمیری دروازہ کے علاقے میں کھڑکی ابراہیم علی خاں[1] میں رہتے تھے۔ یہیں انہوں نے ایک نیلام گھر بھی جاری کیا تھا۔ کہتے ہیں شمالی ہندوستان میں یہ ادارہ اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ تھا۔ اس میں دور دراز کے تاجر اپنا مال لے کر آتے اور قیام کرتے۔ مال ہفتے میں ایک بار سجایا جاتا اور پھر نیلام ہوتا۔ اس نیلام گھر میں بڑے بڑے رؤسا اور امرا آتے اور بیرونی ممالک کے عجائبات خریدتے تھے۔

---

[1] غدر سے پہلے اس محلے کو گذرگی اعتقاد خاں کہتے تھے ۱۲

مولانا محمد باقر صاحب کی مسجد
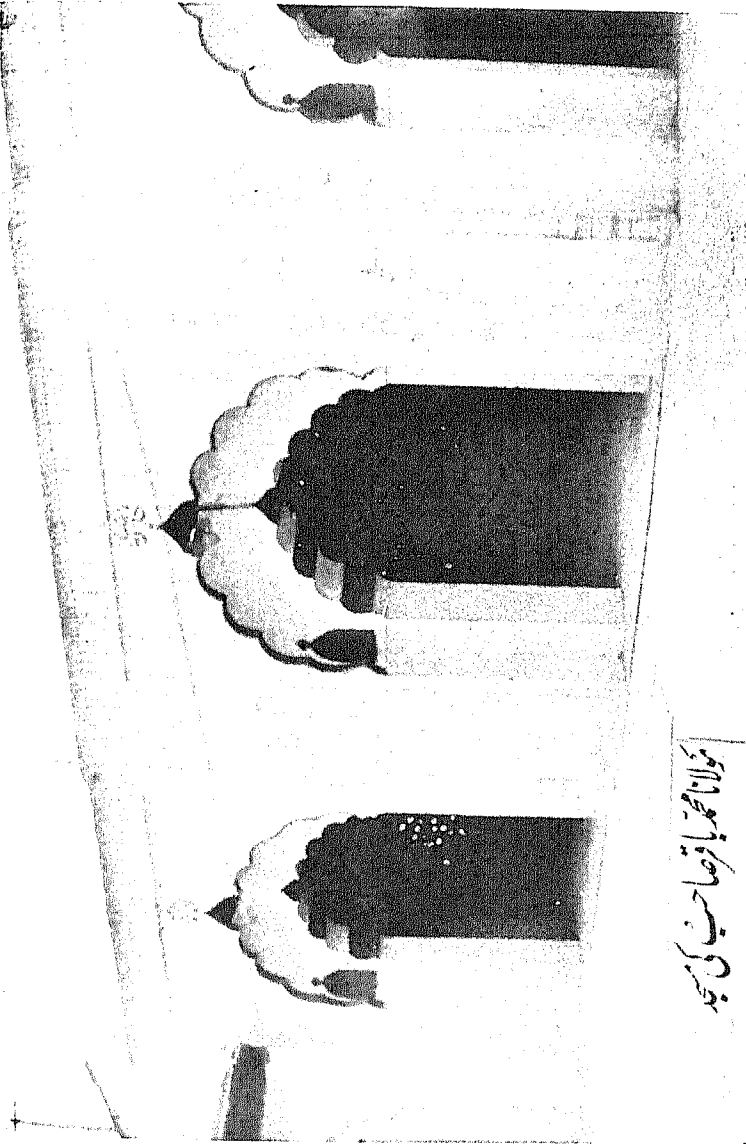
مولانا مرحوم نے ایک امام باڑہ بہ نیت وقف اسی محلے میں تعمیر کیا تھا۔ "تعزیت گاہ امام دارین" ذوق نے اس کی تاریخ تعمیر کہی تھی۔ یہ مکان اب بھی ہمارے تصرف میں ہے۔ اس کے ساتھ اور بھی سات مکانات تھے جو مستورات، منشی جی اور مؤذن کے لئے مخصوص تھے۔ اب ان میں سے دو ہمارے پاس ہیں۔ سب جائداد غدر میں ضبط ہوکر نیلام ہوگئی۔ یہ دو نو مکان والد مرحوم نے خرید لئے تھے۔ ورنہ غدر کے بعد نیلام ہوکر کسی اور کے قبضہ میں چلے گئے تھے۔ اسی مکان کے قریب ایک مسجد بھی ہے۔ جو مولوی محمد باقر کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بھی مولانا کی وقف کردہ ہے اور ابھی تک قائم ہے۔

ہمارا مکان اب تک مولوی محمد باقر کا امام باڑہ کہلاتا ہے۔ جو وسعت کے لحاظ سے محلے میں سب سے بڑا ہے۔ پہلے یہ عمارت یک منزلہ تھی۔ اب دو منزلہ کرالی ہے۔ اس کا نقشہ تقریباً ایسا ہی ہے جیسا کہ مغلیہ سلطنت کے دور میں بڑی بڑی حویلیوں کا ہوا کرتا تھا۔ دالان در دالان، پہلوؤں میں صحنچیاں اور ان کے ساتھ کوٹھڑیاں، دالانوں کے آگے چبوترہ، پھر حوض اور اس میں فوارہ، دو سیڑھیاں، نیچے اتر کر بہت بڑا صحن، اس میں کنواں، صحن کے

دونوں طرف دو دالان، سامنے ڈیوڑھی، ڈیوڑھی کے برابر ایک طرف پائخانہ۔ دوسری طرف حمام اور باورچی خانہ وغیرہ۔ اس مکان کی چھتیں بہت خوبصورت تھیں۔ پچیکاری کا کام اور اس میں شیشے جڑے ہوئے تھے۔ اب چھتیں تبدیل کر دی گئی ہیں۔ سنگین ستونوں پر نہایت خوبصورت نقش و نگار تھے۔ جو امتداد زمانہ نے محو کر دیئے۔ اس مکان کے ساتھ ایک اور چھوٹا سا مکان ہے۔ جس کا راستہ علیحدہ بھی ہے اور ڈیوڑھی میں سے بھی جاتا ہے۔ یہ مکان ایک کوٹھڑی اسکے آگے دالان اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل ہے۔ اسکے دروازے پر "لنگر خانہ" کا کتبہ لگا ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے۔ کہ محرم کے زمانے میں اسمیں نیاز کے لئے کھانا تیار ہوتا تھا۔

اسی مکان میں مولانا محمد باقر کی نشست تھی۔ ان کا کتب خانہ اور للیفضو پریس بھی اسی عمارت میں تھا۔ اس مطبع کی چھپی ہوئی ایک کتاب ہمارے پاس بطور یادگار محفوظ ہے۔

غدر کے حالات

سلطنت مغلیہ کا اگرچہ مدتوں پہلے خاتمہ ہو چکا تھا لیکن نام ابھی باقی تھا۔ ابوظفر بہادر شاہ جو خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار

مولانا محمدؐ باقر کے مکان کا اندرونی حصہ
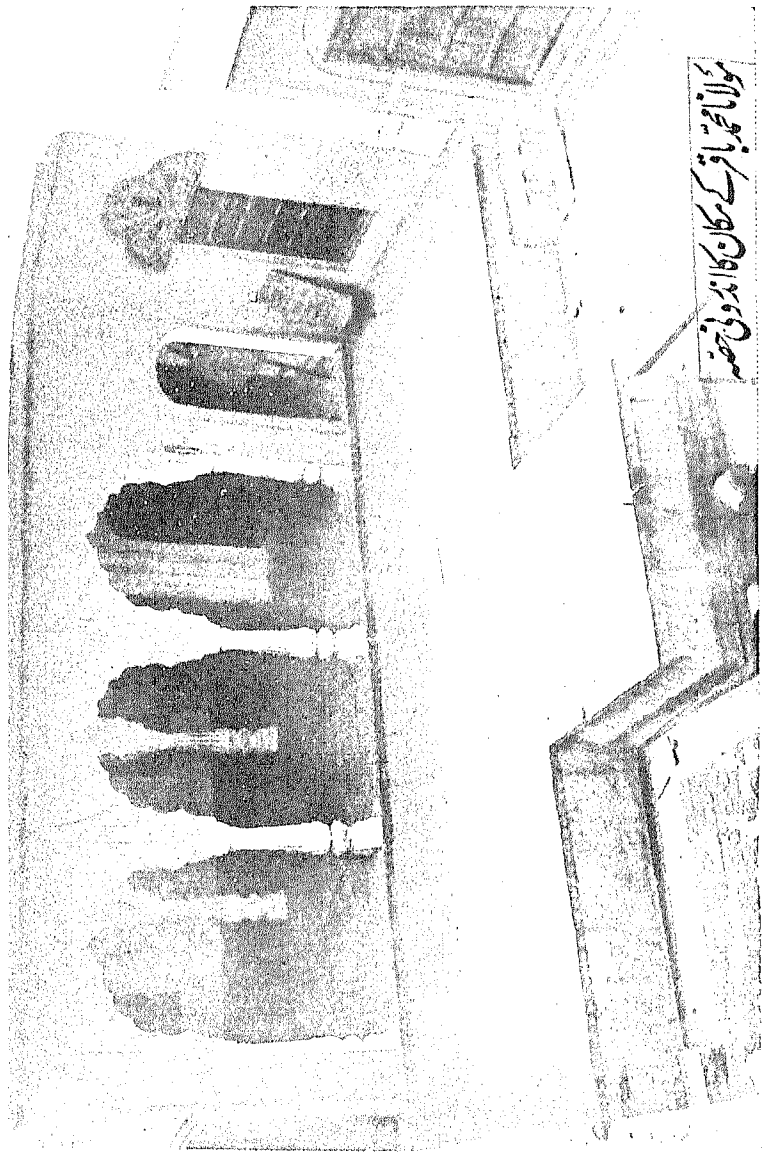
تھے۔ برائے نام بادشاہ تھے۔ ان کی حکومت لال قلعہ کے حصار میں محصور تھی۔ شہر پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ تھا۔ اور اس کا حکم چلتا تھا۔ لیکن فرمانوں پر نام بادشاہ کا پڑتا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں بغاوت کے بگولے اُٹھے۔ فسادات برپا ہوئے۔ ار مئی کو باغیوں کی فوج میرٹھ کی طرف سے آئی اور دہلی پر حملہ آور ہوئی۔ آخر کار دہلی پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا۔ لوٹ مار کا بازار گرم ہوا۔ اور شہر میں طوفانِ قیامت برپا ہو گیا۔ اس بپتا کا اثر سب سے پہلے انگریزوں کی پر پڑا۔ باغیوں نے ان کو بے دریغ لوٹا اور قتل کیا۔ یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں پر بھی رحم نہ کیا۔

مسٹر ٹیلر کا قتل

اس قتل و غارت کا سلسلہ دہلی کالج تک پہنچا۔ کہ اس کا پرنسپل بھی انگریز تھا۔ مسٹر ٹیلر کو اتفاق سے اس حملے کی پہلے سے خبر لگ گئی۔ وہ وہاں سے اپنی جان بچا کر بھاگے۔ اور سیدھے مولانا محمد باقر کے پاس آئے۔ کہ وہی ان کے ایسے قابلِ اعتماد دوست تھے۔ جن پر وہ ایسے کڑے وقت میں بھی بھروسہ کر سکتے تھے۔

چنانچہ مولانا نے ان کو کئی دن اپنے گھر میں پناہ دی۔ لیکن آخرکار کسی نہ کسی طرح یہ راز فاش ہو گیا۔ اب باغیوں نے مولانا کے مکان پر آکر شور مچانا شروع کیا۔ کہ فرنگی کو نکالئے ورنہ ہم گھر میں گھستے ہیں۔ ان حالات سے مولانا ازحد پریشان تھے۔ کہ اب کیا ہو گا۔ مسٹر ٹیلر نے خود ہی ان سے کہا۔ اب مجھے یہاں سے جانے دیجئے۔ یہاں میرا سلامت رہنا غیر ممکن معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک دن علی الصبح مسٹر ٹیلر اور ان کے ساتھی جو غالباً ماسٹر رامچندر عیسائی تھے۔ مولانا کے گھر سے نکلے کہ چپ چاپ نکل جائیں اور باغیوں کی نظروں سے بچ کر انگریزی فوج سے جا ملیں۔ مولانا کے مکان سے کمپنی کی فوج تقریباً دو تین فرلانگ پر ڈیرے ڈالے پڑی تھی۔ مگر بیچ میں شہر کی فصیل حائل تھی۔ اور مکان اور فصیل میں مشکل سے آدھ فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ مسٹر ٹیلر مکان سے نکلے باغیوں نے گلی سے نکلتے ہی ان پر حملہ کیا۔ جیسے پہلے ہی سے منتظر تھے۔ وہ بھاگے اور تمام محلے میں بھجو پکڑیو کا شور برپا ہو گیا۔ مسٹر ٹیلر کو جب جان بچانے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ تو وہ مولانا محمد باقر کی مسجد کی طرف لپکے۔ مولانا اندر کے دروازے سے مسجد میں پہلے سے پہنچ چکے تھے۔ اور وضو کر رہے تھے۔ مسٹر ٹیلر دوڑ

کر ایک حجرے میں چھپے۔ لیکن باغی بھی برابر ہی آ پہنچے۔ مولانا نے ان لوگوں کو منع کیا۔ کہ مسجد کی حرمت کا خیال کریں۔ لیکن ایسے موقعہ پہ کون کسی کی سنتا ہے۔ پھر انہوں نے کئی آدمیوں سے اذان دینے کو کہا۔ لیکن کسی نے نہ سنا۔ آخر انہوں نے خود ہی اذان کہی۔ فسادیوں نے اذان کا بھی احترام مدّنظر نہ رکھا۔ بلکہ مسٹر ٹیلر کو مارنے پیٹنے میں مشغول رہے۔ آخر کار ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے مسجد سے باہر لے گئے اور باہر گلی میں لے جا کر قتل کر ڈالا۔ کہتے ہیں اس دن مولانا کے پیچھے کسی شخص نے بھی نماز نہ پڑھی۔ بلکہ سب تماشے میں محو رہے مولانا نماز پڑھ کر گھر واپس آئے اور گھر والوں کو سارا واقعہ سنایا جس سے سب کے ہوش اُڑ گئے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے ؂

مولانا محمد باقر کی گرفتاری

آخر ستمبر ۵۷ء میں انگریزی فوج نے دہلی کو فتح کر لیا اب جبکہ دہلی پہ انگریزی فوج کا تسلط ہوا تو باغیوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ سب سے پہلے تو ان لوگوں کی باز پرس ہوئی جنہوں نے اس بغاوت میں عملی حصہ لیا تھا۔ پھر ان لوگوں کو شکنجے میں

کیا گیا جن کا قلعہ معلی سے کچھ تعلق تھا۔ اس کے بعد مخبروں نے جس کسی کے متعلق مخبری کی اس کو گرفتار کیا گیا۔ آخرکار ہر خوش پوش اور خوشحال شخص کی باری آئی اور جذبۂ انتقام اس قدر بھڑکا کہ ہر مسلمان بغاوت کا ملزم ٹھہرا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ مولانا محمد باقر ان لوگوں میں تھے۔ جن کے متعلق مخبری کی گئی تھی۔ چنانچہ ان کو بھی گرفتار کیا گیا۔

بعض لوگوں کا بیان ہے۔ کہ مسٹر ٹیلر وقت رخصت مولانا محمد باقر کو مدرسہ دہلی کے متعلق کچھ کاغذات دے گئے تھے اور یہ کہہ گئے تھے کہ جب دہلی پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو جائے۔ تو یہ کاغذات افسر اعلیٰ کو پہنچا دینا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ان کاغذات پر انگریزی میں یہ بھی لکھ گئے تھے۔ کہ اگر مولانا محمد باقر چاہتے تو ہماری جان بچا سکتے تھے۔ بہرحال اس وقت کوئی انگریزی پڑھا لکھا شخص موجود نہ تھا۔ کہ اس امر کی تصدیق کرتا۔ مولانا کو ان کے ہمدردوں نے منع کیا۔ کہ وہ کاغذات افسر اعلیٰ تک نہ پہنچائیں۔ لیکن اُنہوں نے کہا۔ کہ میں نے مسٹر ٹیلر سے وعدہ کیا ہے۔ اور میں اسے ضرور پُورا کروں گا۔ نیز مجھے پُورا بھروسہ ہے۔ کہ مسٹر ٹیلر نے میرے خلاف کچھ نہ لکھا ہو گا۔ آخرکار وہ کاغذات انہوں نے افسر اعلیٰ تک پہنچا دئے۔ اور لوگوں کا کہنا درست ثابت ہُوا۔ کہ ان کو مسٹر ٹیلر کے قتل کے جرم میں ماخوذ کر لیا گیا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ مولانا کا اخبار سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار کا ہوا خواہ تھا۔ اور ان کا قلعہ معلی سے بھی خاص تعلق تھا۔ اس لئے ان پر بغاوت کا الزام عائد کیا گیا۔ اس وقت کے حالات ثابت کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ غلط تھا۔ مسٹر ٹیلر جیسے دوست سے یہ ہرگز اُمید نہیں ہو سکتی تھی۔ کہ وہ اپنے دوست کے متعلق کسی قسم کی ریشہ دوانی کرتے۔ خاص طور پر ایسے حالات ہیں کہ وہ اس کے گھر میں کئی دن تک محفوظ رہے۔ اور اسکے بعد اپنی مرضی اور حالات سے مجبور ہو کر اس کی پناہ سے نکلے۔ مسٹر ٹیلر کا مولانا کی پناہ سے نکل کر مارا جانا بھی کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر وہ اس وقت گھر سے نہ نکلتے تو باغی لوگ یقیناً گھر میں گھس آتے اور ان کو وہیں پکڑ کر مار ڈالتے۔ اس وقت تو قصور صرف اتنا تھا کہ مولانا عمائد شہر میں سے تھے اور مسلمان تھے۔ پھر قلعہ معلے سے بھی کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رکھتے تھے۔ بس یہی ان کے سب سے بڑے جرم تھے۔

غرض مولانا کو گرفتار کیا گیا۔ اور دہلی دروازے کے باہر پہنچا دیا گیا۔ وہاں پہلے سے کثیر تعداد باغیوں کی موجود تھی۔ اور ان سب کے لئے موت کا حکم صادر ہو چکا تھا۔ لیکن کچھ پتہ نہیں تھا کہ پھانسی کس وقت دی جائے گی۔ یا کس وقت سب کو یکبارگی

گولیوں سے اُڑا دیا جائے گا۔

مولانا کے گرفتار ہونے کے بعد گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ شہر میں جو کچھ ہو رہا تھا۔ اس کی افواہیں الگ ہوش اُڑائے دیتی تھیں۔ چنانچہ سب سے پہلے یہ انتظام کیا گیا کہ جو کچھ زر و جواہر اور زیورات وغیرہ گھر میں موجود تھے۔ وہ یکجا کر کے ایک صندوق میں بند کئے اور تقریباً نصف رات گذرنے پر اس کو مسجد کے کنوئیں میں لٹکا دیا[1]۔ کہ اللہ میاں کے حوالے۔ تقدیر کے ہوں گے تو مل جائیں گے ورنہ خدا زندگی دے تو اور بن جائیں گے۔

غرض دار و گیر اور قتل و غارت نے ایسی لا انتہا صورت اختیار کی کہ کوئی معزز خاندان محفوظ نہ رہا۔ لوگ اپنی جانیں اور عزتیں بچا کر بھاگ گئے۔ جو لوگ بھاگ نہ سکے۔ ان کو فتحیاب لشکر کے سپاہیوں نے زبردستی گھروں سے نکال دیا۔ مال و اسباب لوٹ لیا۔ مردوں کو پکڑ کر حاکم وقت کے سامنے پیش کیا۔ ان تبدیلیوں کو بلا تحقیق یا تو گولی سے اُڑا دیا گیا۔ یا پھانسی پر لٹکا دیا۔ اگر کوئی ہنگامہ فرو ہونے کے بعد ہاتھ آیا۔ تو اس پر مقدمہ چلا کر سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ دشمنی نکالنے کا یہی زریں موقع تھا جس کو کسی سے عداوت تھی۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال کر اس کو پھانسی پر لٹکوا دیتا

[1] غدر کے بعد حکومت نے شہر کے سب کنوئیں صاف کرائے۔ اور ان میں سے جو کچھ برآمد ہوا۔ اس پر قبضہ کر لیا ۱۲

تھا۔ غرض شاہجہان آباد جس کی چہل پہل ضرب المثل تھی۔ چند دنوں میں بالکل خالی ہو گیا۔ شہر کے گلی کوچوں میں زن و مرد کی لاشیں پڑی سڑتی تھیں۔ اور اُٹھانے کو کوئی آدمی نہ ملتا تھا۔ حیادار عورتوں کی لاشوں سے گھروں کے کنوئیں پڑے سڑ رہے تھے۔ غرض شہر دہلی گنج شہیداں کا نظارہ پیش کرتا تھا۔

گھر کی تباہی اور دہلی سے روانگی

انہی خانماں بربادوں میں مولانا محمد باقر کا خاندان بھی تھا۔ مولانا آزاد نے آبِ حیات میں ایک جگہ لکھا ہے۔ کہ فتحیاب لشکر کے بہادر دفعتہً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد یہاں سے نکلو۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا۔ اور میں حیران تھا۔ کہ کیا کیا اُٹھا کر لے چلوں۔

اس وقت آزاد کی عمر تقریباً ۳۰ سال کی تھی۔ اور ان کے ساتھ تقریباً ۲۲ آدمیوں کا کنبہ تھا۔ جو مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل تھا۔ آزاد کی بہن، ان کی بیوی، دو صاحبزادیاں جن میں سے ایک کی عمر تقریباً ایک سال کی تھی۔ اور دوسری چھ سات برس کی تھی۔ پھوپھیاں پھوپھی

کی لڑکی، مولانا محمد باقر کی حرم۔ ان کے سالے، ان کی بیوہ بال اور بچے، بڑی پھوپھی کے بیٹے، ماما ئیں، اور ماما کا لڑکا۔ پریس کے منتظم منشی بشیر حسین، ان کی بیوی اور چھ بچے۔ غرض یہ سب کے سب تعداد میں ۲۲ تھے۔ جو مولانا محمد باقر کے مکانات اور ان کی نگرانی اور سرپرستی میں زندگی بسر کرتے تھے۔ پردے میں بیٹھنے والی بیبیاں جو ایک قدم نہیں اُٹھا سکتی تھیں۔ چادریں سروں پر ڈال کر گھر سے باہر نکلیں۔ لشکریوں نے گھر کی کسی ایک چیز کو بھی ہاتھ نہ لگانے دیا۔ آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے۔ "کہ بھرا ہوا گھر سامنے تھا۔ اور میں حیران تھا۔ کہ کیا کیا کچھ اُٹھا کر لے چلوں۔ کہ دفعتہً استاد ذوق کی غزلوں کے جُنگ پر نظر پڑی۔ یہی خیال آیا۔ کہ محمد حسین! اگر خدا نے کرم کیا۔ اور زندگی باقی ہے۔ تو سب کچھ ہو جائے گا۔ مگر اُستاد کہاں سے پیدا ہوں گے۔ جو یہ غزلیں پھر آکر کہیں گے۔ اب ان کے نام کی زندگی ہے۔ اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو وہ مرکر بھی زندہ ہیں۔ یہ گئیں تو نام بھی باقی نہ رہے گا۔ وہی جنگ اٹھا بغل میں مارا۔ سجے سجائے گھر کو چھوڑ ۲۲ نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا۔ ساتھ ہی زبان سے نکلا۔ کہ حضرت آدم بہشت سے نکلے تھے۔ دلّی بھی ایک بہشت ہے۔ انہی کا پوتا

ہوں، دہلی سے کبھی نہ نکلوں"۔

یہ آشفتہ حال قافلہ رنج وغم اور بربادی سے تباہ حال تھا۔ کہ اس حال میں گھر سے نکل کر قریب کی ایک گلی میں بیٹھ گیا۔ یہ گلی آج تک دھوبی واڑے کے نام سے موسوم ہے۔ یہ خانماں برباد لوگ یہاں سے اکٹھے ہو کر شہر سے باہر نکل جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ کہ یکایک ایک گولہ زمین پر آ گرا۔ اس کے دھماکے سے مولانا آزاد کی ایک شیر خوار لڑکی جس کی عمر تقریباً ایک سال کی تھی۔ دہل گئی۔ اور اس پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ یہ حالت کئی دن تک رہی اور آخر اسی حال میں وہ بھی انتقال کر گئی۔ یہ قافلہ دھوبی واڑہ سے روانہ ہو کر برف خانے پہنچا۔ برف خانہ جنتر منتر کے قریب واقع تھا۔ اور جنتر منتر یہاں سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ لوگ بڑی مصیبت جھیل کر وہاں تک پہنچے۔ اور جان میں جان آئی۔ اس وقت دلّی کے برباد شدہ لوگوں کو کوئی پانی پلانے کا بھی روادار نہ تھا۔ کہ کہیں خود بھی بغاوت کے الزام میں ماخوذ نہ ہو جائے۔ کسی درخت کے نیچے ڈیرے ڈال دیئے۔ اور کھانے پینے کی فکر ہوئی۔ کہ کئی دن سے چھوٹے بڑے سب فاقوں سے تھے۔ پیٹ بڑا دوزخ ہے۔ جس کو ہر حال میں بھرنا ہی پڑتا ہے

جو کچھ کسی کے پاس حسنِ اتفاق سے رہ گیا تھا۔ وہ اس نے نکال کر پیش کیا۔ وہاں ہزار دِقتوں سے سولے کی تول آٹا ملا۔ ایسی حالت میں توا چولہا کہاں سے ملتا۔ مٹی کے ٹھیکرے میں آٹا گوندھا، پتھر جمع کرکے اُن کا چولہا بنایا۔ اِدھر اُدھر سے درختوں کے پتّے اور سوکھی ٹہنیاں جمع کیں۔ اور آگ جلائی۔ ٹھیکرے سے ہی سے توے کا کام لیا اور کچّی پکّی روٹیاں پکا لیں۔ کہاں سے مانگ تانگ کر لہسن۔ مرچیں اور نمک مہیّا کیا۔ اسے بھی پتھروں پر پیسا اور چٹنی تیار کی گئی۔ میری والدہ بیان کرتی ہیں کہ آزاد مرحوم کہا کرتے تھے "بیٹی! اس لہسن کی چٹنی اور ٹھیکروں پر پکی ہوئی روٹی میں ایسا مزہ آیا کہ کبھی پلاؤ۔ زردے اور قورمہ بریانی میں نہیں آیا۔"

یہاں بیٹھ کر یہ فیصلہ ہوا۔ کہ تمام قافلہ منشی بشیر حسین کے ساتھ سونی پت روانہ ہوجائے۔ منشی صاحب چھاپہ خانہ کے منتظم تھے۔ اور ان کے والد بھی ان سے پہلے یہی خدمت بڑی دیانتداری سے انجام دیتے رہے تھے۔ اسلئے ان پر ہر قسم کا بھروسہ تھا۔ بدقت تمام بیل گاڑیاں کرایہ پر کی گئیں۔ اور تمام سواریاں منشی صاحب کی نگرانی میں سونی پت روانہ ہوگئیں۔ آزاد کو ہرچند سب

نے کہا کہ ہمارے ساتھ چلو اور اپنی جان کو مزید خطرے میں نہ ڈالو
لیکن انہوں نے کہا کہ اللہ نگہبان ہے۔ میں ایک مرتبہ اپنے والد
سے ضرور ملوں گا۔ آخر سب روتے پیٹتے روانہ ہوگئے۔ اور آزاد
وہاں سے اپنے اُستاد کا کلام بغل میں دبائے سیدھے دہلی آئے ۔

آزاد کی والد سے آخری مُلاقات

یہاں شہر پر انگریزی فوج کا پورا تسلّط تھا۔ اور کسی معقول
آدمی کے لئے آزاد پھرنا جان کھونے کے مراوف تھا۔ حالات کو
دیکھ کر سخت پریشانی ہوئی۔ کوئی یاور اور مددگار نظر نہ آتا تھا۔
اول تو کسی کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ اور جس کا سُراغ ملتا تھا۔ وہ نفسی
نفسی کی کشمکش میں اپنے پرائے کو بھولے ہوئے تھا۔ آخر انہیں
ایک سکھ جرنیل کا خیال آیا کہ وہ مولانا محمد باقر کا دوست تھا۔
دل نے کہا۔ یہی ایک شخص ہے جو شفیق باپ تک بکیں بیٹے
کی رسائی کرا سکتا ہے۔ اس کے پاس پہنچے۔ پے در پے حادثات
اور انقلاب نے حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اول تو وہ پہچان ہی نہ سکا۔
جب اس نے پہچانا تو گلے سے لگا لیا۔ حالات دریافت کئے۔

آزآد نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ اس نے کہا۔ شہر کی حالت تمہیں
معلوم ہی ہے۔ تمہارا ایک لمحہ بھر بھی یہاں رہنا خطرے سے
خالی نہیں۔ لیکن انہوں نے پھر بھی اپنی آرزو پوری کرنے پر
اصرار کیا۔ آخر اس نے وعدہ کیا کہ اچھا جس طرح بھی ہوگا میں
تمہاری مدد کروں گا۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے یہ مشورہ
دیا کہ اپنا لباس تبدیل کرو۔ اور میرے سائیس کا لباس پہنو۔ کہ
اس شہر میں جان اسی طرح محفوظ رہ سکتی ہے۔ آزاد نے اسی
پر عمل کیا۔ کہتے ہیں پہلے اس نے خود دہلی دروازے کے باہر جاکر
باغی قیدیوں کا معائنہ کیا۔ کہ لق و دق میدان میں پڑے تھے۔ نہ
ان کے پاس تن ڈھانکنے کو کپڑا تھا اور نہ پیٹ بھرنے کو روٹی۔
بھوک اور پیاس سے ماہی بے آب کی طرح تڑپتے تھے۔ ہر شخص
دن کی دھوپ اور رات کی سردی سے نڈھال بلکہ نیم جان تھا۔
یہی وہ لوگ تھے۔ جو شاہ جہان آباد کی روح رواں اور رؤسا
کہلاتے تھے۔ لیکن آج ناگہانی موت اور بے اندازہ آلام نے
ان کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ چاروں طرف سنگین فوجی پہرہ تھا۔ کہ
کوئی جان بچا کر نکلنے نہ پائے۔ جرنیل سردار نے واپس آکر
آزاد کو ان حالات سے آگاہ کیا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ دوسرے

روز جرنیل صاحب اپنے گھوڑے پر چلیں اور آزاد بحیثیت سائیس کے اس کے ساتھ ساتھ دوڑیں۔ اور اس طریقے سے قیدیوں تک پہنچ جائیں۔

دوسرے روز اسی تجویز پر عمل ہوا۔ آزاد سائیس کا لباس پہنے جرنیل کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلے۔ اور آخر اس مقام پر پہنچے جہاں باغی قیدی اپنی زندگی کی آخری ساعتیں گزار رہے تھے۔ کوئی بھوک پیاس سے رو رہا تھا۔ کسی کو موت اور بربادی کا الم بےچین کئے تھا۔ بہت سے بےفکرے اس عالم میں بھی بےفکر تھے۔ شطرنج، چوسر اور گنجفے کی بازی لگ رہی تھی۔ انہی لوگوں میں ایک طرف کو ایک مردِ خدا خلوصِ دل سے عبادت میں مصروف تھا۔ چہرے پر سکون و اطمینان کے آثار تھے۔ یہی[1] آزاد کے شفیق بڈھے باپ تھے۔ بہت دیر کے بعد نظر اٹھائی تو تھوڑے فاصلے پر اپنا پیارا۔ لاڈوں کا پالا۔ جگر گوشہ سائیس کے لباس میں کھڑا ہوا نظر آیا۔ ایکدم چہرے پر پریشانی کے آثار ظاہر ہوئے آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اِدھر یہی حالت بیٹے پر گذری۔ دُنیا آنکھوں کے سامنے اندھیر ہو گئی۔ جب نظر نے یاوری کی۔ تو دیکھا کہ ہاتھ سے اشارہ کر رہے

[1] مولانا محمد باقر کی عمر اس وقت ستر سال سے زائد تھی۔

ہیں۔ کہ بس آخری ملاقات ہوگئی۔ اب رخصت ہو اور دیر نہ کرو اس اشارے کے بعد اُنہوں نے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے۔ خُدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ ایسی حالت میں اپنے پیارے اور اکلوتے بیٹے کے لئے کیا کیا دُعائیں مانگی ہونگی۔

آزاد نے اس وقت لاکھ ضبط کیا۔ لیکن نہ ہو سکا۔ وہاں سے روتے ہوئے رخصت ہوئے اور اس وقت تک اس نادار جرنیل کی حفاظت میں رہے۔ جب تک کہ شاہجہان آباد کی یہ مقدس اور معصوم روحیں قفس عنصری میں قید رہیں ؛

پُر اثر وظیفہ

آزاد کو بچپن سے وظیفے اور ورد پڑھنے کا شوق تھا قاعدہ ہے۔ کہ جس ماحول میں انسان تربیت پاتا ہے۔ وہ اس کی طبیعت پر اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے۔ چونکہ ان کا خاندان مجتہدین کا خاندان تھا۔ اسلئے وظائف اور اوراد کا شوق بھی قدرتی تھا چنانچہ اُنہوں نے جرنیل صاحب کے مکان میں رہ کر "سورۂ مزمل" کا ورد شروع کیا۔ یہ وظیفہ چودہ دن آدھی رات کے بعد پڑھا جاتا ہے۔ اور چودہ دن کے بعد دلی مُراد بر آتی ہے۔ آزاد کو اس

وظیفہ پر بڑا بھروسہ تھا۔ جرنیل صاحب کے کیمپ کے پاس ایک کھنڈر مکان تھا۔ جو اس وظیفہ کے لئے نہایت مناسب تھا۔ آزاد چودہ راتیں برابر وظیفہ پڑھ کر اس کھنڈر میں سوتے رہے۔ آخری رات کو انہوں نے خواب میں دیکھا۔ کہ کوئی شخص آیا ہے اور کہہ رہا ہے۔ "محمد حسین اُٹھ۔ لے کنجیاں لے" یہ آواز تین مرتبہ کان میں آئی اور ان کی آنکھ کھُل گئی۔ اُٹھ کر اِدھر اُدھر کنجیاں تلاش کرنی شروع کیں۔ آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ قفل مراد کی کنجیاں ہاتھ آگئیں۔

دہلی سے کوچ

آخر شہر میں یہ افواہ پھیلی۔ کہ تمام قیدیوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا ہے۔ آزاد عجب عالم میں دہلی سے نکلے۔ صدمات اور پریشانیوں نے انہیں بڈھا کر دیا تھا۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی، کہیں جانے کا راستہ نہ ملتا تھا۔ اُستاد کے کلام کا پلندہ بغل میں تھا۔ اس کے علاوہ سکھ سردار نے چلتے وقت ایک چھوٹی سی دری۔ اور آٹا وغیرہ گوندھنے کے لئے ایک لکڑی کا

کٹھڑا (تسلا) بھی دے دیا تھا۔ وہ بھی ساتھ تھا۔ اور شہر سے باہر نکلنا چاہتے تھے۔ کہ ایک فرنگی نے ٹوکا اور ساتھ ہی اپنی بندوق کی سنگین سے سر کا پلندا اُٹھا کر زمین پر دے مارا۔ اور کہا۔ اے بڈھا۔ اس میں کیا ہے؟ سنگین اور پاؤں کی مدد سے پلندا کھول ڈالا۔ جب اس میں سے سوائے پرانے کاغذ کے پرزوں کے اور کچھ برآمد نہ ہوا۔ تو کچھ بکتا ہوا چل دیا۔ آزاد نے بدقت تمام کاغذات جمع کئے اور جلدی جلدی باندھ کر آگے روانہ ہوئے یہاں تک کہ شہر سے باہر نکل گئے۔

آزاد نے ایک نقل مثنوی "حب وطن" میں بیان کی ہے غالباً یہی وہ جذبات ہیں۔ جو اس وقت ان کے سینے میں موجزن ہوں گے۔

دِلّی کہ جو ہمیشہ سے کانِ کمال ہے — جو باکمال اس میں ہے وہ بے مثال ہے
اِک شخص واں ستار نوازی کی جان تھا — پر جان سے عزیز تھا دِلّی کو جانتا
آیا دکن سے خلعت و زر اس کے واسطے — اور نقد بہر زادِ سفر اس کے واسطے
ہر چند منہ تو دِلّی سے موڑا نہ جاتا تھا — پر ہاتھ سے یہ مال بھی چھوڑا نہ جاتا تھا
دِلّی کو یہ بھی چھوڑ کے سوئے دکن چلے — پر جیسے کوئی چھوڑ کے بلبل چمن چلے
پہنچے مگر ابھی تھے در راج گھاٹ پر — جو دفعتہً نظر پڑی جمنا کے پاٹ پر

دریا کی لہریں دیکھ کے لہرایا ان کا دل — اور دلّی چھوٹتے ہوئے بھر آیا ان کا دل
منہ پھیر کر نگاہ جو نہی شہر پر پڑی — جلوہ دکھاتی جامع مسجد نظر پڑی
تب وہ پیامبر کہ جو آیا دکن سے تھا — اور ان کو لے چلا وہ چھڑا کر وطن سے تھا
دیکھا نگاہ یاس سے اور اس سے یہ کہا — پیچھے چلیں گے پہلے مگر یہ تو دو بتا
ایسی تمہارے شہر میں جمنا ہے یا نہیں — منہ دیکھ کر وہ اس کا ہنسا اور کہا نہیں
پھر سوئے شہر اشارہ کیا اور یہ کہا — مسجد بھی اس طرح کی دکھا دو گے واں بھلا
وہ شخص مسکرایا کہ یہ کیا سوال ہے — اس خانۂ خدا کا تو ثانی محال ہے
ہے اپنی طرز میں یہ نرالی جہان سے — اتری زمیں پہ جس کی شبیہ آسمان سے
یہ بات اسکی سنتے ہی چپ ہو کے بیٹھ گئے — اور بولے خیر ہے کہ روانہ نہیں ہوئے

جمنا نہیں ہے جامع مسجد جہاں نہیں
سنتے بھی ہو میاں ہمیں جانا وہاں نہیں

پورب کی گردش

دہلی سے نکلنے کے بعد یہ کٹڑا دری جو سکھ جرنیل کا عطیہ تھا اور ان کے پیارے استاد کا کلام ہمیشہ حرز جان رہا۔ آوارۂ وطن ہو کر خدا جانے آزاد کہاں کہاں گئے۔ لوگ کہتے ہیں[1]۔ پورب کی طرف

[1] آبحیات میں لکھا ہے کہ وہ کچھ مدت لکھنؤ میں رہے ۱۲

نکل گئے تھے۔ صوبجات متحدہ و اودھ میں قسمت آزمائی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن غدر کا ہنگامہ محض دہلی تک محدود نہ تھا۔ بلکہ سارے ہندوستان پر محیط ہوا چاہتا تھا۔ غرض کہیں بھی قرار نہ ملا۔ کچھ مدت مارے مارے پھرے اس خانماں بربادی کی سیاحت میں اُنہوں نے مختلف ذرایع سے روزی پیدا کی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کیا کیا دِقتیں پیش آئی ہوں گی۔ اور کن کن مصیبتوں میں گرفتار رہے ہونگے کہتے ہیں۔ اُنہوں نے کچھ دن کسی فوجی سکول میں بھی ملازمت کی۔ مگر چند ماہ کے بعد اسے بھی ترک کر دیا۔

پنجاب کو واپسی

ریاست جیند میں قسمت آزمائی

آخر وسط ہند میں تقریباً چھ مہینے کے بعد پنجاب کی طرف پھرے۔ جیند میں کچھ عرصہ قیام کیا۔ وہاں کسی نہ کسی طرح راج دربار میں شاعری کی بدولت رسائی ہوئی۔ کہتے ہیں مہاراجہ صاحب نے ازراہِ قدردانی کچھ انعام و اکرام بھی دیا۔ لیکن آزاد اس پر

قناعت نہ کر سکے۔ جیند کے قیام کے دوران میں انہوں نے متعدد قصیدے لکھے اور مہاراجہ صاحب کی خدمت میں پیش کئے۔

ان قصائد کو پڑھنے کے بعد آزاد کی پریشان حالی کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے۔ جب وہ کسی جگہ ابھی قیام پذیر نہ ہوتے تھے۔ اور اس فکر میں تھے کہ کہیں سے کوئی معقول سہارا ملے۔ تو وہاں مقیم ہو جائیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ وہاں بھی پاؤں نہ جمے اور جو وہ چاہتے تھے۔ وہ حاصل نہ ہوا۔ ہم جیند کے قیام کا تعیّن نہیں کر سکتے۔ کہ وہاں وہ کتنی مدت رہے۔ اس وقت تک ان کی زندگی بھی محفوظ نہ تھی۔ کیونکہ غدر فرد ہونے کے بعد ان کے وارنٹ گرفتاری کٹ چکے تھے۔ اور گرفتار کرانے کیلئے پانسو روپے کا انعام بھی مقرر تھا۔

لدھیانہ میں آنا۔ پریس میں مُلازم ہونا

جب جیند کے دربار میں قسمت نے یاوری نہ کی تو آزاد وہاں سے بھی نکلے۔ لدھیانہ میں ان دنوں ارسطو جاہ مولوی رجب علی شاہ صاحب میر منشی گورنر پنجاب نے مجمع البحرین کے نام سے ایک

پہ پریس جاری کر رکھا تھا۔ یہ رہی رجب علی شاہ ہیں۔ جو مولانا محمد اکبر
اور مولانا محمد باقر کے شاگرد تھے۔ لدھیانہ پہنچ کر آزاد ناظم مطبع سے
ملے۔ حسن اتفاق سے انہیں ان دنوں ایک کاتب کی ضرورت تھی
آزاد ایک نو پریس کے کام سے اچھی طرح واقف تھے۔ دوسرے
انہوں نے بچپن میں کتابت بھی سیکھی تھی۔ کہ پرانے زمانے کے لوگ
اپنے بچوں کو خوشنویسی ضرور سکھاتے تھے۔ چنانچہ آزاد نے اپنے
خط کا نمونہ پیش کیا جو منتظم صاحب نے پسند فرمایا۔ اور ان کو ملازم
رکھ لیا۔ کتابت کے کام کے ساتھ ساتھ مولوی رجب علی صاحب کے
بچوں کی تعلیم بھی آزاد صاحب کے سپرد ہوئی۔ رجب علی صاحب
اکثر دورے میں رہا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی لدھیانہ آتے تھے۔ آزاد
اس پریس میں کاتب کی خدمات نہایت دیانتداری او خوش اسلوبی
سے انجام دیتے رہے۔ وہ اپنے فرائض منصبی سے جب فرصت
پاتے تو اپنے اُستاد کے کلام کا دفتر کھول بیٹھتے۔ اور اس کو درست
کرکر کے لکھتے۔ بچے بھی یہ باتیں بڑی دلچسپی سے دیکھتے۔ وقت گذرتا
گیا۔ اور اچھا گزرا۔ یہاں تک کہ رجب علی شاہ صاحب لدھیانہ آئے
بچوں نے ان سے اپنے نئے اُستاد کا ذکر کیا اور یہ بھی بتلایا کہ وہ دہلی
کے رہنے والے ہیں۔ اور جب فرصت پاتے ہیں۔ شعر اشعار لکھتے

رہتے ہیں۔ رجب علی شاہ صاحب کو بھی ملنے کا اشتیاق ہوا۔ کہ دہلی کا ایسا کون شخص آ پھنسا ہے۔ کہتے ہیں۔ جب آزاد کی شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ تو عجب منظر تھا۔ پے در پے صدمات اور انقلابات سے آزاد بڈھے ہو گئے تھے۔ اور پہچانے نہ پہچانے جاتے تھے۔ انہوں نے آزاد کو پہچانا۔ گلے سے لگایا۔ حالات پوچھے اور ہر طرح کی خاطر جمعی کی۔ تنخواہ میں بھی اضافہ کیا اور مجبور کیا کہ اپنے گھر والوں کو بھی یہیں بلا لیں۔

آخر آزاد نے رجب علی شاہ صاحب کی عنایات بے غایات سے مجبور ہو کر اپنے خاندان کو جو اس وقت تک سونی پت میں منشی بشیر حسین کی مہمانی میں تھا۔ لدھیانہ پہنچنے اور مع الخیر ہونے کی اطلاع دی۔ پھر مولوی صاحب کے کہنے سننے سے سفر خرچ بھی بھیجا کہ لدھیانہ آ جائیں۔ چنانچہ سارا خاندان سونی پت سے لدھیانہ آ گیا۔

جو کام اس وقت آزاد نے اختیار کیا تھا۔ وہ اگرچہ ان کے گزارے کے لئے بہت کافی تھا۔ انہیں چودہ پندرہ روپے ماہوار ملتے تھے۔ لیکن ان کی بلند ہمت اور ترقی کرنے کا جذبہ انہیں آگے پہنچانا چاہتا تھا۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ موجودہ کاروبار محض

چلنے کا سہارا ہے۔ درحقیقت قدرت نے ان کو کسی اور کام کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس وقت غدر کو ڈھائی تین سال ہو چکے تھے۔ دہلی سے نکلے ہوئے لوگ جہاں جہاں موجود تھے۔ وہ اپنی معافیوں کی تصدیق کرا کر آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن آزاد کو ابھی تک اطمینان نہ تھا کیونکہ انہوں نے معافی حاصل نہ کی تھی اور ڈر تھا۔ کہ کوئی بدبخت چغلی نہ کھائے اور بیٹھے بٹھائے کوئی اور آفت آئے۔ لیکن پھر بھی ان کو ارسطو جاہ کی پناہ کا بہت بڑا سہارا تھا۔ اور وہ یہ سمجھے ہوئے تھے۔ کہ اتنی مدت گزر گئی ہے گویا غدر کے تخریبی پروگرام ختم ہو چکے ہیں۔ اور اب تعمیری کاروبار کی باری ہے ؎

ڈائرکٹر تعلیمات سے ملاقات

دسمبر ۱۸۶۰ء میں دورہ کرتے ہوئے ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب لدھیانہ آئے۔ اور ڈاک بنگلے میں قیام پذیر ہوئے۔ آزاد کو ان کی آمد اور قیام کا پتہ چل گیا۔ اور وہ کسی نہ کسی طرح ان تک جا ہی پہنچے۔ اس ملاقات سے ان کا منشا اصلی

یہ تھا۔ کہ تعلیمات سے اپنی دلچسپی کا اظہار کریں۔ اور یہ خیلا دیں کہ میں تعلیم کی توسیع اور ترقی میں محکمۂ تعلیم کو کیا امداد دے سکتا ہوں۔ کہا جاتا ہے۔ کہ ڈائرکٹر سے ملاقات بہت بار آور ثابت ہوئی" اور انہوں نے آزاد کے خیالات کو پسند کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ صاحب بہادر کے دماغ سے وہ گفتگو بہت جلد محو ہو گئی۔ اور اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا٭

ڈاکخانہ لاہور میں مُلازم ہونا

اسی اثنا میں معلوم ہوا کہ مرزا محمد علی مولانا محمد باقر کی حقیقی بہن کے بیٹے محکمہ ڈاک خانہ جات لاہور میں پوسٹماسٹر ہو گئے ہیں۔ آزاد نے اس وقت کو غنیمت جانا کہ لاہور پہنچنے کی سبیل نکلی۔ وہ مدت سے ایسے موقعہ کی تلاش میں تھے۔ لاہور میں اگرچہ ان دنوں تعلیم کا کوئی خاص چرچا نہ تھا۔ لیکن حالات سے اندازہ ہوتا تھا۔ کہ یہ شہر پنجاب کا دارالخلافہ ہے۔ یہاں محکمۂ تعلیمات میں بڑی بڑی شاہراہیں پیدا ہوں گی۔ جن میں ترقی کرنے کی بہت گنجایش ہو گی۔ چنانچہ آزاد لاہور گئے۔ اور

ان کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی مرزا محمد علی صاحب نے کمال مہربانی فرمائی۔ پہلے ان کو اپنے پاس رکھا۔ پھر محکمۂ جنرل پوسٹماسٹر میں سررشتہ دار کی جگہ دلوادی۔ یہاں بھی آزاد کو وہی چودہ پندرہ روپے تنخواہ ملتی تھی۔ اور سچ پوچھو تو بہت غنیمت تھی۔ ملازم ہونے کے بعد آزاد اپنے گھر والوں کو بھی لاہور لے آئے۔ اور باقاعدہ اقامت پذیر ہو گئے۔

ڈائرکٹر تعلیمات سے دوبارہ ملاقات

۲۵ مئی ۱۸۶۱ء کو آزاد نے ڈائرکٹر تعلیمات کو ایک خط لکھا جو مکتوبات آزاد[1] میں شائع ہو چکا ہے۔ اس خط میں انہوں نے اس ملاقات کا بھی حوالہ دیا جو لدھیانہ کے ڈاک بنگلے میں ہوئی تھی۔ فرماتے ہیں:۔

"بہ اتفاق آب و دانہ فدوی لاہور میں پہنچا۔ اور محکمۂ محتشمہ حضور جنرل پوسٹماسٹر صاحب بہادر میں سررشتہ دار ہے۔ چونکہ حضوری خدمت حکام سے علاوہ اپنے نفع ذاتی کے اس قسم کے فوائد منتصور ہیں۔ جن سے کہ خلق خدا کو فوائد حاصل ہوں

[1] مکتوبات آزاد (کریمی پریس لاہور) ۲۲۳

اور خدا اور نائبانِ خدا رضامند ہوں۔ اور واسطے ہمیشہ کے نام نیک یادگار رہے۔ اس واسطے فدوی بھی آرزومند قدمبوسی حضور کا ہے۔ امیدوار ہوں۔ کہ بنظرِ علم پروری اور جوہر شناسی اپنے وقت فرصت سے فدوی کو مطلع فرمایئے۔ کہ حاضر حضور ہو کر دولتِ لازوال حاصل کروں۔"

ایک عزیز کی ریشہ دوانی اور اس کا خوش آیند نتیجہ

یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ اس ملاقات کا کیا نتیجہ نکلا لیکن اتنا ضرور پتہ چلتا ہے۔ کہ ڈائرکٹر بہادر سے تعلقات بڑھتے چلے گئے۔ اور وہ امیدیں جو مدتوں سے دل و دماغ میں پیچ و تاب کھا کھا کر رہ جاتی تھیں۔ ان کی بارآوری کے دن قریب تر آ گئے چنانچہ مرزا محمد علی صاحب باوجود قریبی عزیز ہونے کے ان کے بڑھتے ہوئے رسوخ کو نہ دیکھ سکے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ انہوں نے خفیہ طور پہ گورنمنٹ کو اطلاع دی۔ کہ یہ محمد حسین

آزاد وہی شخص ہے۔ جس کے باپ کو غدر کے بعد مسٹر ٹیلر کے
قتل کے الزام میں گولی سے اڑا دیا گیا تھا۔ اور اس کے وارنٹ
گرفتاری جاری ہو گئے تھے۔

غدر کو اگرچہ تین چار سال گذر چکے تھے۔ اور عام معافی کا
اعلان بھی ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی حکومت ایسے لوگوں سے احتراز
کرتی تھی۔ جنہوں نے غدر میں انگریزوں کے خلاف کوئی عملی حصہ لیا
تھا۔ چنانچہ تحقیقات شروع ہوئی اور شدہ شدہ اس کی اطلاع
آزاد کو بھی مل گئی۔ گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ کہ دیکھئے اب کیا ہوتا
ہے۔ بہرحال یہ تحقیقات بہت جلد ختم ہو گئی۔ اور آزاد پر کسی قسم
کی سخت گیری نہیں کی گئی۔ بلکہ اس کا اثر الٹا یہ ہوا کہ آزاد ڈاکخانہ
کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر محکمہ تعلیم میں آ گئے۔ جہاں ان کو
بجائے پندرہ روپے مہینے کے مبلغ پچیس روپے ماہوار ملنے لگے۔

محکمہ تعلیم میں ملازم ہونا

میجر فلران دنوں محکمہ تعلیمات کے ڈائرکٹر تھے۔ ان کو
علوم مشرقی سے بہت دلچسپی تھی۔ ماسٹر پیارے لال آشوب جو

دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے ماتحت کام کرتے تھے۔ وہ آزاد کو دہلی کالج کے زمانے سے جانتے تھے۔ ایک ہی وقت میں دونوں نے کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ بعض ادبی تاریخوں میں لکھا ہے۔ کہ پیارے لال صاحب آشوب نے آزاد کو سررشتہ تعلیمات کے ڈائرکٹر سے روشناس کرایا۔ لیکن مذکورالصدر خط سے صاف ظاہر ہے کہ آزاد کی پہلی ملاقات ان سے لوہ صیانہ کے ڈاک بنگلے میں ایک سال قبل ہو چکی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ خود ان سے براہ راست ملے۔ پنڈت جی چونکہ آزاد کے ہموطن تھے اور دہلی کالج کے زمانے سے ان کی قابلیت علمی سے اچھی طرح واقف تھے۔ اسلئے اُنہوں نے آزاد کی سفارش ضرور فرمائی ہوگی۔ جس کے لئے آزاد کا خاندان اُن کا از حد شکرگذار ہے۔ بہرحال ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے کہ پنڈت جی کی قدر دانی اور سفارش آزاد کے حق میں بہت مفید ثابت ہوئی

ڈائرکٹر تعلیمات ان دنوں محکمہ تعلیمات کی طرف سے ایک تعلیمی اخبار جاری کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہیں ایک اُردو اخبار نویس کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ یہ تجویز تھی کہ انجمن پنجاب کے نام سے ایک انجمن بھی قائم کی جائے۔ جو

پنجاب میں تعلیم و تعلم کو فروغ دے۔ اور یہ اخبار اس انجمن کے مفید مقاصد کی تبلیغ و اشاعت کرے۔ اس تحریک اور تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آزاد کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ان کو اخبار نویسی کا پہلے سے تجربہ حاصل تھا۔ انجمن کے مقاصد کی ترویج کے لئے اخبار اتالیق پنجاب جاری ہوا۔ ماسٹر پیارے لال اسکے ایڈیٹر ہوئے اور آزاد سب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ یہاں یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے کہ بحیثیت سب ایڈیٹر کے آزاد کو پچیس روپے ماہوار ملتے تھے۔

آزاد نے اس اخبار کو مقبول اور اس کے مقاصد کو کامیاب بنانے میں بڑی سرگرمی اور جانفشانی سے کام کیا۔ جس سے ڈائرکٹر بہادر بہت خوش ہوئے اور ان کو ابتدائی جماعتوں کی ریڈریں تیار کرنے کا کام دے دیا گیا۔ جب آزاد کو تصنیف و تالیف کا کام مل گیا۔ تو وہ سب ایڈیٹری سے سبکدوش ہو گئے۔ ان کی جگہ مولانا الطاف حسین صاحب حالی کو ملازم رکھا گیا۔

بعض غلط فہمیوں کا ازالہ

"تاریخ ادب اردو" مصنفہ رام بابو سکسینہ میں مذکور ہے

اور اس کے مصنف نے یہ بات غالباً خمخانۂ جاوید سے نقل کی ہے۔ کہ آزاد پھرتے پھراتے ۱۸۶۴ء میں لاہور پہنچے اور مولوی رجب علی شاہ کے ذریعہ سے پنڈت من پھول لفٹنٹ گورنر کے میر منشی سے ملے۔ اور ان کی سفارش سے سررشتۂ تعلیم کے محکمہ میں پندرہ روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ چھوٹے عہدے کی وجہ سے ان کو اتنا موقعہ نہ ملتا تھا۔ کہ بڑے بڑے افسران سرکاری سے مل سکیں۔ جو ان کی لیاقت اور قابلیت کا لحاظ کر کے ان کو کسی اعلیٰ عہدے پر پہنچا دیں۔ اتفاق سے ماسٹر پیارے لال صاحب آشوب دہلوی کے ذریعہ سے جو ان کے بہی خواہ دوست تھے۔ میجر فلر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم تک رسائی ہو گئی۔ جو علوم السنۂ شرقیہ سے کمال ذوق رکھتے تھے۔ اور رسائی کی صورت یہ ہوئی کہ میجر صاحب نے لفظ "ایجاد" کو مؤنث لکھا تھا۔ جس کی نسبت تذکیر و تانیث کا کچھ شبہ تھا۔ ماسٹر پیارے لال آشوب نے آزاد کو بلایا اور ان سے اس کی بابت دریافت کیا۔ انہوں نے 'ایجاد' کو مذکر کہا۔ اور جب سند مانگی گئی تو یہ شعر سودا کا پڑھا ؎

ہائے کس بھڑوے کا یہ ایجاد ہے   لنسخے میں معجون زر نباد ہے

اس اہم واقعہ کے متعلق میں نے والد مرحوم سے یہ سُنا

ہے۔ کہ آزاد ڈاک خانہ میں ملازم تھے۔ اور ان کو میجر صاحب سے ملاقات کا شرف پہلے سے حاصل تھا۔ ایک دن اتفاق سے صبح کی سیر میں آزاد کی پنڈت جی سے ملاقات ہو گئی۔ پنڈت جی نے چھوٹتے ہی پوچھا کہ کہو بھئی "ایجاد" مذکر ہے یا مونث۔ آزاد نے فوراً کہا مذکر۔ پنڈت جی نے سند مانگی۔ آزاد نے جواب میں فوراً سودا کا مذکورہ بالا شعر پڑھا۔ پنڈت جی نے تمام واقعہ من وعن میجر صاحب سے بیان کیا۔ جس سے آزاد کی زباں دانی اور قابلیت کا سکہ میجر موصوف کے دل پر اور بھی بیٹھ گیا۔ میجر صاحب علوم السنۂ شرقیہ سے بے حد دلچسپی رکھتے تھے۔ اور ان کو ایسے شخص کی ضرورت تھی۔ جو زبان کی تصحیح اور تحقیقات میں انہیں ہر وقت مدد دے۔ اسلئے جب "اتالیق پنجاب" کو جاری کرنے کا سوال در پیش ہوا۔ تو انہیں آزاد سے بہتر اور کوئی شخص نظر نہ آیا۔ چنانچہ اس کام کے لئے ان کی نظر انتخاب نے آزاد کو منتخب کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں آزاد کی ذاتی قابلیت پیش نظر تھی۔ وہاں پنڈت جی کی سفارش بھی برابر کا وزن رکھتی تھی۔

مصنف خمخانۂ جاوید اور تاریخ ادب اردو کا یہ کہنا بھی

سراسر غلط ہے۔ کہ آزاد شروع میں پندرہ روپے ماہوار پر سررشتہ تعلیم میں ملازم ہوئے تھے۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ وہ ۱۸۶۱ء میں پندرہ روپے ماہوار پر ڈاک خانہ لاہور میں سررشتہ دار ہوئے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ یہ ملازمت نہ تو ان کے مذاق کے مطابق ہے اور نہ وہ اس سلسلہ کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ اسلئے انہوں نے آرام کا سانس لے کر اولیں فرصت میں ڈائرکٹر تعلیمات سے ملاقات کی۔ اور اپنے ارادوں اور قابلیتوں کا ازسرنو اظہار کیا۔ چنانچہ انہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ وہ ڈاک خانے کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر انجمن پنجاب کے اخبار اتالیق پنجاب کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

اگرچہ ڈاک خانہ کی سررشتہ داری نے آزاد کو ایک معمولی کلرک کی حیثیت دی تھی۔ لیکن یہ ملازمت بلند خیالات اور اعلیٰ مقاصد کے حصول میں سدّ راہ نہیں تھی۔ وہ شروع سے لے کر آخر تک اس کوشش میں رہے کہ کسی نہ کسی طرح محکمہ تعلیم میں ان کو کوئی معقول جگہ مل جائے۔ جہاں انہیں اپنی مخصوص قابلیت اور بلند ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کا موقعہ ملے۔ چنانچہ میجر فلر کی قدردانی کی بدولت وہ محکمہ تعلیمات میں جا ہی پہنچے۔ جہاں تک

میری تحقیقات اعانت کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ آزاد نے ڈاک خانہ کی ملازمت زیادہ سے زیادہ ایک سال یا سوا سال کی ہے۔ اور اس کے بعد ان کو محکمۂ تعلیمات میں جگہ مل گئی۔

محکمۂ تعلیمات میں شروع شروع میں "اتالیق پنجاب" کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اور انہوں نے اپنے فرائض منصبی کو دن رات کی کوششوں اور شدید محنتوں سے انجام دیا۔ جس سے ان کی شہرت اور قابلیت کا سکہ محکمۂ تعلیم کے تمام افسروں کے دلوں پہ بیٹھ گیا۔ اور ان کے لئے ترقی کے راستے وسیع تر ہوتے چلے گئے۔

سنٹرل ایشیا کی سیاحت

۱۸۶۵ء میں حکومت ہند کی طرف سے ایک منتخبہ جماعت مخصوص سیاسی معلومات بہم پہنچانے کی غرض سے سنٹرل ایشیا کی سیاحت کے لئے بھیجی گئی۔ مولانا آزاد بھی اس کے اراکین میں سے تھے۔ ہندوستان کی سرحد سے نکل کر یہ جماعت جرنیل پنڈت من پھول کی سرکردگی میں روانہ ہوتی تھی۔ علیحدہ علیحدہ ہوگئی۔ چنانچہ

حسب ہدایت آزاد نے بھی اپنا علیحدہ راستہ اختیار کیا۔ دو سال تک
سنٹرل ایشیا کے ممالک کی خاک چھانی اور ضروری معلومات بہم پہنچائیں
یہ ایام ایسی گمشدگی میں گذرے کہ کسی کو کسی کے حال کی خبر نہ تھی۔
پیدل، سواری پر، غرض جس طرح بھی ہو سکا سفر کیا گیا۔ آخر دو سال
کے بعد واپس آئے اور رپورٹ پیش کی۔ کہا جاتا ہے۔ کہ آزاد
نے یہ معلومات اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر حاصل کی تھیں ۔

مولوی امیر بخش صاحب جو مولانا کے شاگرد ہیں۔ اور ابھی بقید حیات
ہیں۔ مولانا کی زبانی روایت کرتے ہیں۔ کہ افغانستان کی سرحد پر مولانا
کو افغانوں نے پکڑ لیا۔ اور کہا تم جاسوس ہو۔ اور ہمارے ملک میں
جاسوسی کرنے آئے ہو۔ اس لئے ہم تم کو قتل کریں گے۔ ہزار منتیں
کیں اور یقین دلایا کہ میں جاسوس نہیں ہوں۔ لیکن انہوں نے
ایک نہ مانی۔ آخر کار ان منچلے افغانوں نے یہ تو مان لیا۔ کہ تم جاسوس
نہیں ہو۔ لیکن پھر یہ سوال اٹھایا۔ کہ تم کافر ہو۔ اور ہمارے ملک
میں کافر کی سزا قتل ہے۔ مولانا نے ہر چند یقین دلایا۔ کہ میں کافر نہیں

ہوں۔ مسلمان ہوں۔ قرآن کی آیات پڑھیں۔ نماز سنائی۔ لیکن کسی نے نہیں مانا۔ اور اس بات پر اڑے رہے۔ کہ تم کافر ہو اور تم نے دھوکا دینے کے لئے نماز اور آیتیں وغیرہ یاد کر لی ہیں۔ آخر مولانا نے پوچھا۔ خدا کے لئے تم یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے یقین آ سکتا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور کافر نہیں ہوں۔ وہ سب سوچ میں پڑ گئے۔ آخر ان میں سے ایک شخص جو کسی قدر زیادہ سمجھدار تھا۔ بولا یہ دیکھ لو۔ کہ یہ شخص مختون بھی ہے یا نہیں اگر مختون ہے تو مسلمان ہے ورنہ کافر۔ اس فیصلے کو سب نے تسلیم کر لیا۔ آخرکار ثابت ہو گیا کہ مولانا مسلمان ہیں۔ اور کافر نہیں۔ غرض اس قسم کے بہتیرے دلچسپ واقعات پیش آئے۔ جن سے عجیب عجیب طریقوں سے خلاصی ہوئی۔ اور زندہ سلامت بانیل مرام ہندوستان واپس آئے ؛

سخندانِ فارس میں ضمناً آزاد نے اس وسطِ ایشیا کے سفر کے کچھ دلچسپ واقعات لکھے ہیں۔ مثلاً لسانیات کے طالب علموں کو تنبیہ فرمائی ہے۔ کہ لفظوں کی ظاہری حالت سے ان کی اصلیت کا پتہ لگانے میں اکثر دھوکا ہوتا ہے۔ اور اس کی مثال ایک نقل سے دی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"ایک دفعہ جوانی کی ہمت اور شوقِ سیاحت مل کر مجھے ترکستان
کے ملک میں لے گئے۔ بلخ سے چند منزل آگے بڑھ کر ہمارا قافلہ اُترا
ان ملکوں کے لوگ کم علم۔ کم معلومات ہوتے ہیں۔ اپنی آرام طلبی اور
رستوں کی دشواری انہیں اِدھر کے سفر میں سدِّ راہ ہوتی ہے۔
اسلئے ہمارے ملک کے آدمیوں کے ساتھ شوق سے ملتے ہیں۔ اور
ذرا ذراسی بات معلوم کرکے خوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ گاؤں سے
لوگ آکر قافلہ میں پھرنے لگے۔ دستور ہے کہ اہل آبادی۔ روٹیاں
گھی۔ دُودھ۔ دہی۔ انڈے۔ گوشت۔ مرغیاں۔ قالین (اپنے
ہاتھ کے بُنے ہوئے) لاتے ہیں۔ قافلہ والے قیمت میں کپڑا۔ سوئیاں
رنگ۔ پیتل کی انگوٹھیاں۔ چکنیاں۔ کانچ اور شیشہ کے دانے
دے کر خریدتے ہیں۔ ایک ترک بچہ طالب علم میرے بستر کے پاس
آبیٹھا۔ دو تنگے[1] میرے ہاتھ میں تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے
کرتے اس نے پوچھا۔ در ملک شما ہمچنیں تنگہ رواج دارد۔ ایک افغان
کا بستر برابر تھا وہ بولا کہ در ہند روپیہ کلدار است۔ فرنگی بر آں
تصویر خود را نقش می کند۔ طالب علم نے میری طرف دیکھا کر کہا
چہ طور۔ میں نے کہا راست می گوید[2]۔ روپیہ ہندسہ برابر تنگہ شما است

---

[1] تنگہ ترکستان میں بخارا میں چاندی کا سکہ ہوتا ہے ۵ رسے کچھ زیادہ
[2] افغان کا مطلب یہ تھا کہ تصویر کے ذکر سے ہماری بت پرستی ثابت کرے اور ترک بچہ کے خیالات
اسلامی کو چمکا دے۔

اس نے پوچھا تصویر چرا نقش می کنند؟ میں نے کہا سکہ سلطنت است ، در دور دائرہ نامم و میانہ اش تصویر شاہ است - آں ہم تمام نیست - کلّہ اش را نقش می کنند - ترک بچہ بولا - آرے ہمیں سبب روپیہ را کلدار نامم کردہ باشند - کلدار کو کلّہ دار کو مخفف سمجھا - خوب سمجھا - مگر غلط سمجھا "

بدخشاں کی جوئیں

جب مولانا آزاد سفارتی مشن پہ روانہ ہوئے تھے - تو اپنے اہل وعیال کو (دہلی میں) اپنی سسرال کے گھر چھوڑ گئے تھے - چنانچہ اس سفر سے واپس ہوئے تو سیدھے دہلی آئے - میری والدہ بیان کرتی ہیں - اور انہوں نے میری دادی کی زبانی سنا ہے - کہ جب مولانا دہلی پہنچے تو عجب حالت تھی - پہچانے نہ جاتے تھے - لباس اور طرح وضع سے بالکل درویش اور قلندر معلوم ہوتے تھے - جب انہوں نے اپنا سفری لباس اتارا تو وہ ایک دیوار پہ ڈال دیا گیا - کہتے ہیں - ان کپڑوں میں کابل و بدخشاں کی اسقدر بڑی بڑی جوئیں تھیں - کہ وہ تھوڑی سی تمازت آفتاب سے باہر

نکل پڑیں۔ اور ساری دیوار بلامبالغہ بالکل سیاہ ہوگئی۔

اردو فارسی کی ریڈریں تصنیف کرنا

اس سفر کو بخیر و خوبی طے کرنے کے بعد مولانا آزاد کی شخصیت کو سرکاری حلقے میں اور بھی زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی۔ اور اب وہ ابتدائی جماعتوں کا نصاب مرتب کرنے کے کام پر مقرر ہوئے مولانا آزاد کی عمر کا یہی وہ حصہ ہے۔ جس کو بہترین دور کہا جا سکتا ہے۔ گویا ان ایام میں وہ اس سے کہیں زیادہ بہتر خدمات انجام دے سکتے تھے۔ لیکن افسوس کہ یہ زرّیں وقت ان چھوٹے چھوٹے کاموں پر صرف ہوا جو اگرچہ بظاہر چھوٹے چھوٹے کام تھے۔ لیکن بڑے اہم اور محنت طلب تھے۔ آزاد نے یہ ابتدائی نصاب جن کو اردو فارسی کی پہلی دوسری اور تیسری کتاب کہا جاتا ہے۔ بڑی محنت اور جانفشانی سے تیار کیے۔ اور ملک نے ان کی خاطر خواہ قدردانی بھی کی۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ آزاد کی شہرت کو قائم کرنے میں ان کارناموں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

دخترکشی اور تعلیمِ نسواں کی تحریک

یہ وہ زمانہ تھا۔ جب ہندوستانی تعلیمِ نسواں کا نام سُن کر کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ مولانا نے تعلیم نسواں کی ترویج و توسیع میں بھی بڑی کوشش صرف کی۔ ان خدمات کا اعتراف محکمہ تعلیمات کے ڈائریکٹر نے بار بار کیا۔ اور مولانا کی کوششوں اور کامیابیوں کو بہترین توصیفی الفاظ میں سراہا۔ انہی دنوں پنجاب میں دخترکشی کی رسم بد کا بھی بہت زیادہ رواج تھا۔ مولانا نے اس کی بیخکنی میں بھی بہت نمایاں حصہ لیا۔ اور کامیابی حاصل کی۔ اس موضوع پر انہوں نے ایک بہت جامع مضمون لکھ کر شایع کیا۔ جس میں بہت سی قیمتی تجاویز اور باثر طریقے اس بری رسم کو دُور کرنے کے لئے پیش کئے۔ یہ مضمون اُنہوں نے ایک جلسۂ عام میں پڑھا۔ جس میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے! مولانا کے اس مضمون اور ان کی پیش کردہ تجاویز نے خاطرخواہ اثر پیدا کیا۔ چنانچہ حکومت نے بھی اس کی اہمیت اور قابل قدر تجاویز کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اور مولانا آزاد کو

دو سو روپے کا انعام دیا۔

گورنمنٹ کالج اور اورینٹل کالج میں پروفیسر[1] ہونا

محکمہ تعلیم کی ملازمت کے دوران میں مولانا آزاد کے بیشتر اوقات "اتالیق پنجاب" اور "پنجاب میگزین" کی سب ایڈیٹری میں صرف ہوئے۔ اس کے بعد حسنِ اتفاق سے گورنمنٹ کالج میں عربی کے پروفیسر کی جگہ بنی۔ تو مولانا کی خدمات گورنمنٹ کالج میں منتقل کر دی گئیں۔ یہ واقعہ غالباً ۱۸۷۰ء کا ہے ۱۸۸۹ء تک وہ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اسی دوران میں وہ اورنٹیل کالج میں عربی اور فارسی ادبیات کے

---

[1] مولانا کا نام اس زمانے کے بعض یونیورسٹی کیلنڈروں اور اورنٹیل کالج کی سالانہ رپورٹوں میں اساتذہ اورنٹیل کالج میں درج نہیں ہے۔ البتہ گورنمنٹ کالج کے اساتذہ کی فہرست میں ان کا نام "اسسٹنٹ پروفیسر عربی" کی حیثیت سے درج ہے۔ مثلاً کیلنڈر بابت ۱۸۷۴-۷۵ء میں ص ۱۳۰ پر اور کیلنڈر بابت ۱۸۸۱-۸۲ء میں ص ۵۹ پر اور کیلنڈر بابت ۱۸۸۴-۸۵ء میں ص ۲۲ پر۔ اس زمانے میں چونکہ اورنٹیل کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۷ پر)

پروفیسر رہے۔ یا یوں سمجھئے۔ کہ دونوں کالجوں ہیں کام کرتے رہے لیکن جب گورنمنٹ کالج اور اورنٹیل کالج میں کام زیادہ ہوگیا تو وہ اورنٹیل کالج کے کام سے دست بردار ہو گئے ؂

مولانا آزاد کی خط وکتابت کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خدمات گورنمنٹ کالج میں منتقل ہونے کے بعد بھی ان کا تعلق ڈائرکٹر تعلیمات کے دفتر سے باقی تھا۔ جولائی ۱۸۸۱ء میں تعطیلات کے واسطے کالج بند ہوا۔ اور تمام طلبا اور اساتذہ رخصت ہو گئے۔ لیکن مولانا آزاد کو حکم ہوا کہ وہ لاہور ہی میں ٹھہریں۔ وہ اس پابندی سے بہت پریشان ہوئے۔ چنانچہ اُنہوں نے انجمن کے

ایک ہی جگہ تھے اساتذہ کا دونوں کالجوں میں تعلیم دینا بآسانی ممکن تھا۔ مگر اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی کہ مولانا اورنٹیل کالج میں بھی تعلیم دیتے تھے۔ دیوان بہادر راجہ نریندر ناتھ صاحب نے گورنمنٹ کالج سے ۱۸۸۵ء میں ایم۔ اے پاس کیا ان سے دریافت کیا گیا۔ تو انہوں نے یہی فرمایا۔ کہ جن سالوں میں وہ کالج میں تھے مولانا کو اورنٹیل کالج سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ آغا محمد باقر صاحب سے لکھ کر دوبارہ دریافت کیا گیا' وہ فرماتے ہیں" مکتوبات آزاد میں اکثر رپورٹیں طبع ہو گئی ہیں۔ جن میں اورنٹیل کالج کے طلبہ کے متعلق رپورٹ کی گئی ہے۔ میری ایک مرتبہ پرنسپل وولنر سے گفتگو ہوئی تھی۔ انہوں نے بھی باتوں باتوں میں ذکر کیا تھا۔ کہ مولانا اورنٹیل کالج میں پڑھایا کرتے تھے۔ ممکن ہے وہ پروفیسر گورنمنٹ کالج میں ہوں اور اورنٹیل کالج کے طلبہ کو بھی پڑھاتے ہوں۔ اگر آپ کے کیلنڈر اس معاملے میں خاموش ہیں۔ تو ان کی تصنیفات کے ان نسخوں کو دیکھ کر آپ کو اندازہ ہو سکے گا۔ جو ۱۸۷۰ء سے ۱۸۹۰ء تک چھپی ہیں"۔ پرنسپل وولنر ۱۹۰۳ء میں لاہور آتے اسلئے وہ ذاتی علم سے اس بارے میں کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ مصنفات آزاد جن کا ذکر ہوا افسوس کہ اس وقت موجود نہیں۔ مکتوبات آزاد ص ۲۱۹ پر بعض سرحدی طلبہ کے متعلق رپورٹیں درج ہیں۔ مگر وہ اس بارے میں فیصلہ کن نہیں ہیں (ایڈیٹر)

مہتمم کو لکھا (مہتمم ڈائرکٹر صاحب تھے) کہ "فدوی کو اجازت سفر کی دی جائے۔ کیونکہ فدوی کے لاہور میں رہنے سے (اس کام میں) فائدہ نہ ہوگا"۔ جب اس خط کا کوئی جواب نہ آیا تو پھر یاددہانی کی اور لکھا۔ کہ آج تیسرا دن ہے۔ اب تک انجمن (پنجاب) سے جواب حاصل نہیں ہوا۔ کہ سکرٹری انجمن لاہور میں نہیں۔ میری اجازت فقط آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ اگر روکیں تو کسی لفٹنٹ گورنر کو روکیں۔ کسی گورنر کو روکیں۔ محمد حسین عاجز غریب کا روکنا آپ کے لئے کچھ فخر نہیں۔ امید ہے کہ اجازت مرحمت ہوگی"۔

کالج کی ملازمت اور مصروفیتیں

تصنیف و تالیف کا دور

گورنمنٹ کالج میں آنے کے بعد آزاد کو فرصت زیادہ ملنے لگی۔ اور ان کو اپنے ارادوں کو پورا کرنے کا صحیح ترین موقعہ

اور وقت ہاتھ آیا۔ چنانچہ یہی وہ زمانہ ہے۔ جس میں انہوں نے اپنی وہ تصانیف تیار کیں۔ جو ادبی دُنیا میں غیر فانی شہرت کی مالک ہیں۔ لیکن پھر بھی محکمۂ تعلیم کسی طرح ان کو آرام سے نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ اکثر کتابیں رائے طلبی کے لئے آجاتی تھیں جن کے مطالعہ اور دیکھ بھال میں کافی وقت ضائع ہو جاتا تھا۔ اگر انکار کیا جاتا تو یہ خطرہ تھا۔ کہ محکمۂ تعلیم کسی سپیشل ڈیوٹی کے لئے ان کی خدمات گورنمنٹ کالج سے مستعار لے لیگا۔ اور اکثر مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ کہ محکمۂ تعلیمات میں کورسوں کی جانچ پڑتال یا نصاب مرتب کرنے کے لئے ان کی خدمات مستعار حاصل کر لی گئیں۔ اور نتیجہ کے طور پر وہ تمام اوقاتِ فرصت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

کالج میں آنے کے بعد ذاتی تصنیف و تالیف کے لئے اگرچہ کافی وقت ملتا تھا۔ لیکن عام طور پر یونیورسٹی کے کورس مرتب کرنے کا کام بھی ان کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ وہ ہر چند ٹالتا اور پہلو تہی کرتے لیکن پھر بھی نہ بچ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ یونیورسٹی اور محکمۂ تعلیم کے پاس کوئی اور ایسا آدمی نہ تھا۔ جو طلباء کی قابلیت اور ان کی دلچسپی اور ذہنیت کو مدِنظر رکھ کر

کورس مرتب کرنا۔ اسلئے یہ کام ہمیشہ انہی کے سپرد ہوتا۔ اسکے علاوہ وہ لاکھ انکار کرتے۔ لیکن امتحانات کے پرچے ان کو دے دیئے جاتے۔ مجبوراً یہ خدمت بھی ان کو انجام دینی پڑتی۔ وہ اپنے ایک مکتوب محررہ ۱۸۸۳ئہ میں لکھتے ہیں :۔

" میرا حال یہ ہے۔ کہ تقریباً ۸ دن ہوئے ہوں گے۔ جو آب حیات اور نیرنگ خیال سے چھٹکارا ہوا۔ مگر اس سال یونیورسٹی مجھ پر پھر مہربان ہوئی۔ زبان اردو میں طلبائے داخلہ کا ممتحن مقرر کیا۔ اور زباندانی میں اردو اور فارسی کا اور ایک حصہ عربی کا۔ ان کے سوالات بنانے ایسا وقت نہیں لیتے۔ مگر کاغذات جو نمبر لگانے کو آئے ہیں وہ چھاتی پر پہاڑ ہیں۔ ۶۱۸ (پرچے) کاغذ ہیں اور آج سے دس دن کی مہلت باقی ہے۔ خدا اس بلا سے جلد مخلصی دے۔ یہ درست ہے۔ کہ اس میں تقریباً ڈیڑھ سو روپے کا فائدہ مجھے ہو جائے گا۔ یا شاید کچھ زیادہ ہو۔ مگر خدا گواہ ہے کہ میں اس پر خاک ڈالتا ہوں۔ منظور فقط اسلئے کیا۔ کہ اس وقعہ کالج کا معاملہ نازک ہو رہا ہے۔ رجسٹرار ناراض ہو جائے گا۔ تو لوگ مجھے احمق بنائیں گے۔ اور کہیں گے کہ ڈاکٹر لائٹنر تو بہ اسباب خاص ناراض ہو گئے۔ اور ان کی ناراضگی

بیشک تدارک پذیر نہ تھی۔ انہیں تو نے کیا سمجھ کر ناراض کیا۔
اسی سبب سے یہ بوجھ سر پر لیا۔ ورنہ آپ یقین مانئے کہ آزاد
روپے کا لالچی نہیں۔ ڈاکٹر لائٹنر صاحب نے کئی دفعہ ممتحن مقرر کیا
اور میں نے صاف انکار کر دیا۔ اب بات فقط اتنی ہے کہ ایک
منشی بھی میں نے ملازم رکھ لیا ہے۔ وہ میرے ساتھ کام کر
رہا ہے۔ مولی اسد اللہ الغالب مظہر العجائب کا فضل شامل
ہونا چاہیئے۔ آپ دیکھیں گے تیسرے ہفتے میں کچھ نہ کچھ (نئی)
تصنیف لے کر حاضر خدمت ہونگا۔"

آزاد کو تصنیف و تالیف کے ذریعہ اپنے ملک کی خدمت
کرنے کی قدیمی آرزو تھی۔ اور وہ ہمیشہ ایسی تصنیفات کی فکر میں
رہتے تھے۔ جس سے ملک اور زبان کی خدمت ہو۔ ۱۸۸۱ء میں
انہوں نے آب حیات کا تذکرہ شایع کیا۔ اس معرکۃ الآرا تصنیف
کی دھوم تمام ملک میں پڑ گئی۔ گویا آزاد کی قابلیت کی شہرت
محکمہ تعلیم کے حصار سے نکل کر ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچی
اور ہندوستان کے تمام اخبارات میں اس کی تعریف میں مقالے
مدتوں شایع ہوتے رہے۔ اس کے بعد آزاد نے اس پذیرائی
کے شکریے میں ایک مضمون سپرد قلم کیا۔ جو اس وقت کے

متعدد اخبارات میں شایع ہوا۔ وہ اسمیں لکھتے ہیں :۔

"اکثر ذوق و شوق کا وقت تھا کہ سوسائیٹیوں اور کمیٹیوں کے مضامین لکھنے میں اُڑ گیا۔ بڑا حصہ عمر گراں بہا کا سررشتہ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں۔ مگر مجھ سے انہوں نے انتہا سے سے بڑھ کر محنت لی۔ جاننے والے جانتے ہیں۔ کہ جب تک انسان خود بچہ نہ بن جائے۔ تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا۔ پھر انہیں بار بار کاٹنا اور بنانا۔ لکھنا اور مٹانا۔ بڈھا ہو کر بچہ بننا۔ پھرتے چلتے سوتے جاگتے۔ بچوں ہی کے خیالات میں رہا مہینوں نہیں بلکہ برسوں صرف ہوئے۔ جب وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوئے۔ خیر میرے پیارے اہل وطن۔ تمہاری خدمت نہ کی تمہارے بچوں کی خدمت کی۔ مگر کاش وہ دن جو میری عمر کی فصل بہار تھی، طبیعت جوان تھی۔ جوش ٹپکتے تھے۔ مضامین برستے تھے اور رنگ اُڑتے تھے۔ ان تصانیف میں خرچ ہوتے جن سے میرے دل کے ارمان نکلتے۔ ملک کی صلاح و اصلاح ہوتی۔ گورنمنٹ کے مقاصد پورے ہوتے۔ تمہاری نظر سے گذرتے۔ تم خوش اور میرا دل خوش ہوتا۔ لیکن بندہ کی بیچارہ کی

آخر نوکر تھا۔ وہ نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اے میرے اہل وطن میں اس حال میں بھی تمہیں نہیں بھولا۔ جو وقت نوکری کے کام سے خالی پاتا۔ اس میں آرام نہ کرتا۔ بہت کم سوتا تھا۔ اپنی معلومات کو اور جو اس سے خیال پیدا ہوتے تھے۔ لکھتا تھا اور رکھتا جاتا تھا۔ اس میں سے یہ اوراق پریشاں نکالے۔ اور آب حیات کا جام بنا کر تمہاری ضیافت طبع کے لئے حاضر کیا۔"

آزاد کو تصنیفات کا شوق سب شوقوں سے بڑھ کر تھا۔ وہ اس کے مقابلے میں بڑے سے بڑے مالی فائدے کی بھی کوئی پروا نہ کرتے تھے۔ اور آب حیات کی قدر دانی اور اس کی پذیرائی نے ان کے اس شوق کو اور زیادہ مشتعل کر دیا تھا۔ اب وہ ہمہ تن تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے۔ یہاں تک کہ جلسوں اور کمیٹیوں میں بھی اکثر شامل نہ ہوتے۔ اور جہاں تک ممکن ہوتا اپنے اوقات تصنیف کے کام میں صرف کرتے۔ آب حیات کے بعد وہ دربار اکبری کی تصنیف میں مصروف ہوئے۔ اور یہ انہماک اس قدر بڑھا کہ وہ اپنے آپ کو بھی بھول گئے۔ رات دن اسی میں لگے رہتے۔ ملنا جلنا۔ نہانا دھونا۔ غرض ضروری سے ضروری کام بھی ترک کر دیا۔ اسی زمانے کا ایک خط میرے

پاس محفوظ ہے۔ یہ خط دربارِ اکبری کے مسودے میں سے برآمد ہوا ہے۔ کسی عقیدت مند نے آپ سے تصویر کی درخواست کی ہے۔ اس خط کی پشت پر تحریر فرماتے ہیں۔ "میں شب و روز دربارِ اکبری کی تکمیل میں مصروف ہوں۔ کئی ہفتے نہیں مہینے گزر گئے۔ نہانے اور کپڑے بدلنے کی بھی نوبت نہیں آئی۔ کھانا پینا۔ سونا۔ آرام کرنا سب مفقود ہے ایسی حالت میں تصویر کا کسے ہوش ہے" اس بیان سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ وہ کس انہماک اور جوش کے ساتھ تصنیف کا کام کرتے تھے۔

۲۰ مارچ ۱۸۸۳ء کے مکتوب میں میر سید حسن بلگرامی کو لکھتے ہیں "پرسوں اتوار کو یہاں ایک بہت بڑا جلسہ تھا۔ لاہور اور امرتسر کے دولت پرست جمع ہوئے۔ کہ کپڑے کی کل پنجاب میں جاری ہو۔ وہاں کوئی بولا۔ آزاد کہاں ہے۔ اس سے بھی پوچھ لو۔ وہیں سے کوئی بولا۔ اس نے کمیٹیوں کو بالکل استعفا دے دیا ہے۔ وہ تو اب تصنیفات میں غرق ہے۔ کسی نے یہ بھی کہا۔ کہ وہ آج کل دربارِ اکبری لکھ رہا ہے۔ مگر اکیلا ہے کوئی رفیق اور مددگار نہیں۔ کئی شخصوں نے کہا پھر وہ کس طرح کی مدد چاہتا ہے۔ جو ہم سے ہو سکتی ہو ہم بھی کریں۔ میں

درماندۂ تدبیر و تائید کیا کہوں۔ کہ میرا کام سوائے خدا اور مولیٰ کے مدد پذیر نہیں۔ یا علی مدد۔ چار بجے ہیں۔ صبح قریب ہے۔ وقت تو قبول کا ہے۔ اگر سائل کی آواز حضور تک پہنچ جائے"

ہم عرض کر چکے ہیں۔ کہ آزاد کو اپنی تصنیفات سے اسقدر دلچسپی تھی۔ کہ وہ ان کے لئے زیادہ سے زیادہ قربانیاں کرنے میں بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ اور چاہتے یہ تھے۔ کہ کسی نہ کسی طرح ان کی وہ کتابیں جو زیر تصنیف تھیں پایہ تکمیل کو پہنچ جائیں۔ اور ان سے ملک کو خاطر خواہ فائدہ پہنچے اور اس کے ساتھ ان کا اپنا نام نیک بھی باقی رہے۔ یہ شوق ان کو بچپن سے تھا کہ میرے علم اور قابلیت کی روشنی سارے ملک میں پھیلے۔

ایک خط میں لکھتے ہیں "عجب ہجوم محنت میں مبتلا ہوں۔ الحمد للہ کہ ۱۰۔ ۱۲ دن کا کام اور رہ گیا ہے۔ اور سخت تر وقت ہے۔ سوا مہینے سے میں دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوں۔ میری حالت ایسی ہوگئی ہے کہ ہر شخص پوچھتا ہے کہ تم کچھ بیمار تھے۔ نعوذ باللہ۔ غالباً میں نے آپ کو نہیں لکھا۔ کہ ایک مہینے سے زیادہ ہوا کہ جموں سے ایک دوست کا خط آیا۔ اس میں لکھا تھا۔ کہ مہاراجہ صاحب ایک تاریخ کی کتاب لکھوانا چاہتے ہیں"

مجھے لکھا تھا۔ کہ تم اس کام کو اپنے ذمہ لو۔ اور لکھو کہ کیا تنخواہ لوگے
میں نے عدیم الفرصتی کا عذر کر کے ٹال دیا۔ ۸۔ ۱۰ دن ہوئے۔ کہ وہ
خود آئے اور کہا کہ ان کی نوکری اختیار کرو تو کیا تنخواہ لوگے۔ اور
اسمیں اصرار کیا۔ میں نے صاف جواب دے دیا۔ اور انکار کیا۔ غالباً
آپ کے نزدیک بھی نامناسب نہ ہوگا۔ میری اپنی کتابیں ناتمام پڑی
ہیں۔ کہ لوگوں کی آنکھیں اور میری جان انہی میں لگی ہے۔ میں کسی کی
کتاب کیا لکھوں۔ طمع کا منہ کالا ہے۔"

غرض آزاد ہمیشہ اپنی تصانیف کو مالی منفعتوں اور فرائض منصبی
سے بھی زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ملازمت چونکہ رزق کی کنجی تھی اسلئے
اس سے دستبردار نہ ہو سکتے تھے۔ لیکن فرصت کا وقت زیادہ سے
زیادہ نکالنے کے لئے انہوں نے ایک حد تک گوشہ نشینی اختیار کر
لی تھی۔ چنانچہ امتحانات کے پرچے دیکھنے سے وہ اکثر انکار ہی کر دیا
کرتے تھے۔ اور مالی فائدے کے لئے اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کرتے تھے۔
ایک اور مراسلے میں انہوں نے میجر سید حسن بلگرامی کو لکھا ہے
کہ "مجھے باوجود انکار کے فارسی کا ممتحن کیا۔ تین پرچے جن کے
۱۷۱۶ کاغذ دیکھنے پڑتے ہیں۔ ایک پلنگ بھرا ہوا ہے۔ دیکھتا
ہوں اور لہو خشک ہوتا ہے کہ الٰہی یہ بوجھ کیونکر اٹھے گا۔ ۔ ۔

خدا گواہ ہے کہ بار بار انکار کیا۔ نہ قبول ہوا۔ ناچار طفل بمکتب منی رود و سے برندش۔

"انصاف کیجئے۔ کہ اب تصنیف کے لئے طبیعت میں جوش پیدا ہو تو کہاں سے ہو۔ برابر خطوط چلے آتے ہیں۔ کہ فرمایئے دربار اکبری کا کیا حال ہے۔ لکچروں کا کیا حال ہے۔ یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ آزاد کا کیا حال ہے"!

آزاد کو تصنیف و تالیف کا اس قدر ہمہ گیر شوق تھا۔ کہ وہ ادبیات کے کسی خاص شعبے تک محدود نہ تھا۔ دربار اکبری اکبر کے زمانے کی تاریخ ہے۔ آب حیات میں شعرائے ہند کا تذکرہ ہے۔ قند پارسی فارسی بول چال پر مشتمل ہے۔ سخندان پارس زبان فارسی کی تحقیقات سے لبریز ہے۔ نیرنگ خیال میں بالکل نئی وضع کے خیالی مضامین ہیں۔ ڈرامہ اکبر کے ذریعہ ڈرامہ کا نمونہ دیا ہے۔ غرض ان کی ہر تصنیف اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کو ادبیات اردو اور فارسی کے ہر شعبے سے شغف تھا۔ اور وہ ہر صنف میں ایک ایسی تصنیف پیش کرنے کے آرزومند تھے جو آنے والے دور کے لئے بہترین نمونے کا کام دے سکے۔ ظاہر ہے وہ شخص جس کے ارادے اس قدر بلند ہوں۔ تن تنہا ان کی تکمیل

سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ لیکن باوجود مشکلات کے جس قدر آزاد کو اپنے ارادوں میں کامیابی نصیب ہوئی ہمارے ملک میں کم مصنفوں کو نصیب ہوئی ہوگی ؛

ہم ذکر کر چکے ہیں۔ کہ ۱۸۷۰ء میں جب آزاد کی خدمات سررشتہ تعلیم سے گورنمنٹ کالج میں منتقل ہوئیں تو تصنیف و تالیف کے متعلق ان کو اپنے دلی ارمان نکالنے کا موقعہ ہاتھ آیا چنانچہ وہ اسی وقت سے اپنی تصنیفات میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ ان کی سب سے پہلی تصنیف آبِ حیات کے نام سے ملک کے سامنے آئی۔ جس کا ہر شخص نے خراجِ تحسین ادا کیا۔ اس قدر افزائی نے مصنف کی ہمت افزائی کی اور وہ دیگر تصانیف کی طرف متوجہ ہوئے۔ گورنمنٹ کالج میں آجانے کے بعد اگرچہ ان کو کافی فرصت ملتی تھی۔ لیکن ان کا دل اور بھی فرصت کے رات دن ڈھونڈھتا تھا۔ چنانچہ وہ پرچے دیکھنے اور نصاب مرتب کرنے سے ہمیشہ خائف رہتے تھے۔ لیکن کیا کرتے خواہی نخواہی یہ خدمات بھی انجام دینی ہی پڑتی تھیں۔ اگرچہ وہ ان کو کسی عنوان پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ لیکن روزی کا معاملہ تھا۔ اسلئے مجبور تھے ؛

نیچرل شاعری

تقریباً پانسو سال سے زائد ہو چکے تھے۔ کہ اردو شاعری پر عشق و عاشقی کا رنگ چڑھ رہا تھا۔ ولی سے لے کر ذوق و غالب تک لاکھوں شاعر ہوئے۔ لیکن سب نے بدستور وہی محبت کے ترانے گائے۔ اور کوئی اپنی ڈگر سے نہ ہٹا مضمون لے دے کر وہی ایک تھا۔ اور ہزاروں بولیاں تھیں۔ آخر اس میں کہاں تک رنگینیاں پیدا ہوتیں۔ اب جدت پسند طبیعتیں اور نئی روشنی کے لوگ نئی چیزیں طلب کر رہے تھے۔ لیکن ہماری شاعری کا دامن ان پھولوں سے خالی تھا۔ جدّت آتی تو کہاں سے آتی۔ کوئی الفاظ کو تبدیل کر کے نالۂ شبگیر بلند کرتا تھا۔ کوئی الفاظ کا لفافہ بدل کر ہزاروں دفعہ کے دوہرائے ہوئے مضامین کا اعادہ کرتا تھا۔ نئے نئے اوزان کے میزان پر فرسودہ مطالب پیش کئے جاتے تھے۔ کسی کی قوتِ فکر میں اگر قوتِ پرواز ہوتی تو دقیانوسی خیالات کو لے کر آسمانوں کی سیر کرتا۔ اور اسی دھن میں اپنے آپ کو بھی بھول جاتا۔ غرض کسی کو کوئی نئی اور دلچسپ راہ نظر نہ آتی

تھی۔ اور آتی بھی تو کیسے۔ سب لکیر کے فقیر تھے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ انسان کے مزاج میں قدرت نے محبت کا درد بھرا ہے۔ اور وہ ہم لوگوں کی رگوں میں جاری و ساری ہے۔ اسلئے جو مزا محبت کے تاروں کو چھیڑنے میں آتا ہے۔ وہ کسی اور نغمے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ہمارے شاعروں کی مرجھائی ہوئی طبیعتیں قدرتی سبزہ زاروں کی طرف رجوع ہی نہ کرتی تھیں اور انہی پامال اور اُجڑے ہوئے باغوں میں محبت کے درد بھرے نغموں اور نالوں سے اپنے ہجران دیدہ اور آفت رسیدہ دل کو خوش رکھنے کی عادی ہو گئی تھیں ۞

آزاد بھی اسی جماعت کے ایک فرد تھے۔ انہوں نے شعرائے دہلی کی محفلیں اور صحبتیں دیکھی تھیں۔ اور اپنے پیارے اُستاد ذوق مرحوم کا زمانہ پایا تھا۔ مگر زمانے کے انقلاب اور اس کے بعد کے اُبھار نے ان کو اس نتیجے پر پہنچایا تھا۔ کہ ان لوگوں سے بڑھ کر کوئی اور شخص مضمون آفرینی اور جدت طرازی نہیں کر سکتا۔ اسلئے فطرتاً ان کی طبیعت عشقیہ شاعری سے ہٹ گئی تھی۔ اور اب کسی نئی چیز کی طلبگار تھی ۞

آزاد کا اپنا م کلام ہنگامۂ غدر میں ضایع ہو چکا تھا۔ جس سے

ان کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ اس حادثہ کا اندازہ کچھ وہی شخص کر سکتا ہے۔ جس کے فرزندانِ معانی اس کی اپنی آنکھوں کے سامنے ضایع ہو جائیں۔ ظاہر ہے۔ شباب کا کلام جس زور کا ہو گا۔ وہ اس شان کے اشعار دوبارہ نہ کہہ سکتے ہوں گے۔ اور پھر اگر بالفرض اس سے بڑھ کر بھی شعر کہہ لئے جائیں۔ تو ان کے اُستاد دوبارہ اس دنیا میں آکر اصلاح نہ دے سکتے تھے۔ اسلئے قدیم شاعری سے نفرت ہو جانا بالکل فطری تھا۔

آزاد کی طبیعت قدرتاً جدت پسند واقع ہوئی تھی۔ اور یہ صفت ان کو ورثہ میں ملی تھی۔ اس کے علاوہ عشقیہ شاعری کے نام لیواؤں اور قدردانوں کا خاتمہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے کر دیا تھا۔ جو بچ رہے تھے وہ اس قدر دل شکستہ تھے۔ کہ انکی طبیعتیں بھول کر بھی شاعری کی طرف رجوع نہ کرتی تھیں۔ نہ وہ شمعِ شاعری رہی تھی۔ اور اب نہ وہ پروانے تھے۔ جو لفظ لفظ پر اپنی جانیں قربان کرتے تھے ۔

غدر کے بعد ہندوستان میں معاشی جد و جہد کا دَور شروع ہو گیا تھا۔ بجائے عیش پرستی اور فنون پروری کے لوگوں کے خیالات اور جذبات دنیاوی کاروبار اور معاشی معاملات کی طرف

متوجہ ہو گئے تھے۔ اسلئے وہ پرانی عشقیہ شاعری کو بے معنی اور لغو خیال کرنے لگے تھے۔ انگریزی تعلیم نے مغربی شاعری کی پسندیدگی اور بھی بڑھا دی تھی۔ شعرا میں سے جو کچھ باقی تھے۔ وہ اپنے کسب معاش کے اور ذرایع اختیار کر رہے تھے۔ اِدھر ہمارے رئیسوں کی ذمہ داریاں بڑھ جانے سے ہمارے شعرا بے حال تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ افسردگی فرسودگی اور مبالغہ آمیزی سے خواہ مخواہ دل متنفر تھے۔ اور نیا خون یہ چاہتا تھا کہ ہماری شاعری بجائے فسردگی اور پژمردگی کے دلوں میں مسرت اور جوش پیدا کرے۔ جس سے زبان کو وسعت اور خیالات کو برتری ہو۔

یہی وہ خیالات تھے۔ جو نئی شاعری کے موجد کے دماغ میں شب و روز موجزن تھے۔ اس پر میجر فلر ڈائرکٹر تعلیم سے تبادلۂ خیالات تازیانے کا کام کرتا تھا۔ میجر صاحب کو مغربی اور مشرقی شاعری پر بحث کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اکثر آزاد سے کہا کرتے کہ آپ بھی اپنی شاعری میں مغربی شاعری کی سی خوبیاں پیدا کریں آزاد اپنے حالات اور حادثات کے باعث مشرقی شاعری سے پہلے ہی دل برداشتہ تھے۔ غدر کے بعد سے انہوں نے شعر کہنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اس کے اور بھی اسباب تھے۔ لیکن ایک وجہ یہ بھی تھی۔

کہ وہ مضامین جو عام طور پر نظم کیئے جاتے تھے نہایت پامال اور فرسودہ تھے۔ وہی بندھے تلے الفاظ، وہی تصوف اور عشق و عاشقی کے معاملات اور زندگی سے بیزاری کا فلسفہ کہ رہی سہی جانِ حزیں کو بھی گھلاتا تھا۔ ان کی پرجوش اور جدت پسند طبیعت اس غیر فطری کاروبار سے متنفر تھی۔ اور اپنی کیفیاتِ قلبی کے اظہار کے لیئے ایک جانفزا گل و گلزار ڈھونڈھ رہی تھی۔ چنانچہ یہ راستہ ان کو نیچرل شاعری کے وسیع اور پُرفضا میدان میں نظر آیا۔ اس نئے راستے پر گامزن ہونے کے لیئے مغربی شعرا کا کلام ضرور ان کی رہبری کر سکتا تھا۔ لیکن افسوس کہ وہ انگریزی زبان سے ناواقف تھے۔ اسلئے انگریزی شعرا کے کلام سے استفادہ نہ کر سکتے تھے۔ آخر کار یہ کام میجر ہلرائڈ اور آزاد کے پُرانے دوست پنڈت پیارے لال آشوب نے کیا۔ وہ آزاد کو نہایت عمدہ عمدہ نظموں کا اُردو میں ترجمہ کر کے دیتے تھے۔ اور آزاد اس کی روشنی میں اپنی سیدھی سادی زبان میں نیچرل نظمیں کہتے تھے۔

یہ نئی نظمیں عام طور پر فطری مضامین پر مشتمل تھیں۔ آخر کار آزاد نے دیکھ لیا کہ فطرت کے خزانے نہ ختم ہونے والے خزانے، اور ان کی رنگینیاں لازوال و نیئے ہیں۔ نیز ان میں یہ خرابی نہیں کہ وہ اردو شاعری کے مضامین کی طرح چار پانچ صدیوں میں فرسودہ اور

پائمال کہلانے لگیں۔ اِس لئے انہوں نے کمر ہمت باندھ لی اور مصمم ارادہ کر لیا کہ اپنے ملک کے نوجوان شعراء کو نیچرل شاعری کی پُر فضا شاہراہ دکھاویں گا۔ کیونکہ اسی پر ملک اور قوم کی ترقی کا دار و مدار ہے۔ بڈھوں سے تو کچھ اُمید نہیں۔ وہ لکیر کے فقیر ہیں۔ جب سُنینگے آزاد نے نیچرل شاعری کی طرح ڈالی ہے۔ تو اپنی اپنی کمریں تھام کر کھڑے ہو جائیں گے اور بے نقط سُنائیں گے۔

مولانا آزاد محی لفت کے فلسفے سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس تحریک کی تبلیغ اس طرح شروع کی۔ جب کہیں کوئی علمی یا ادبی جلسہ ہوتا۔ وہ ہمیشہ ایک نہایت پُر جوش لکچر دیتے۔ جس میں پرانی شاعری کے عیوب اور کمزوریوں کو بیان کرتے۔ پھر نوجوانوں کی جوشیلی طبیعتوں کو اُبھارتے اور ان کو دعوت دیتے۔ کہ اے نوجوانو! ادھر آؤ۔ ملک اور زبان اُردو کی آنکھیں تمہاری طرف لگی ہیں۔ پُرانی شاعری کو ترک کرو۔ عملی دُنیا میں قدم رکھو۔ چباتے ہوئے نوالوں کو کبتک چباؤ گے۔ دیکھو مغرب کے خوش رنگ باغوں میں کیسے کیسے خوشنما پھول کھلے ہیں۔ ان میں خوشبو نہیں۔ تم ان میں مشرق کی خوشبو اور کشش پیدا کرو اور اپنے ملک کو معطّر کرو۔

کچھ مدت اسی طرح یہ پروپیگنڈا جاری رہا۔ آخر وہ دن آگیا کہ

آزآد کی دلی آرزو پوری ہوئی ۔ ۹ مئی ۱۸۷۴ء کو ڈائرکٹر تعلیمات کے ایما سے ایک جلسہ ہونا قرار پایا۔ آزآد نے اس میں ایک نہایت مناسب وقت لکچر دیا۔ جس میں مشرقی شاعری کی حالت زار کا رونا رویا۔ پھر باقاعدہ طور پر نیچرل شاعری سے اُردو شاعری کی امیدیں وابستہ کیں ۔ آخر میں انھوں نے شام کی آمد اور رات کی کیفیت ایک مثنوی میں دکھائی۔ جس کو بے حد پسند کیا گیا۔ سب کے مشورے سے یہ قرار پایا کہ ایک مشاعرہ باقاعدہ قائم کیا جائے۔ اور اسمیں بجائے مصرعہ طرح کے مختلف مضامین پر نظمیں پڑھی جایا کریں۔ چنانچہ یہ مشاعرہ گیارہ مہینے تک جاری رہا۔ اس پر ہندوستان میں ایک غلغلہ اُٹھا۔ پُرانی شاعری کے جادوگروں نے کھنڈروں میں سے اپنی اپنی کمریں ٹھونک کر نکل آئے اور مدتوں نامہ و پیام کے ذریعے اور بالمشافہ آزآد پر ملامت کے تیر برساتے رہے۔ اس مخالفت کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ مشاعرہ بند ہوگیا۔ لیکن نیچرل شاعری کا افتتاح کچھ ایسی نیک ساعت میں ہوا تھا۔ کہ یہ مخالفت اور تہدید بے اثر ثابت ہوئی اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اس قسم کی نظمیں عام طور پر تصنیف ہونے لگیں۔

نیچرل شاعری کے مشاعرے اکثر مولانا آزآد کے مکان پر ہوا

کرتے تھے اور ان مشاعروں میں زیادہ تر طلباء حصہ لیتے تھے۔ ان دنوں مولانا آزاد گورنمنٹ کالج میں فارسی اور عربی ادبیات کے پروفیسر تھے۔ اسلئے ان کو نوجوان شاعر طلباء کو نئی طرز کی نظمیں لکھنے کے لئے ابھارنے کا خوب موقعہ ملتا تھا۔

انہی دنوں مولانا حالی محکمۂ تعلیم لاہور میں ملازم تھے۔ مولانا آزاد نے ان کو بھی دعوت عمل دی۔ جس کو انہوں نے بسر و چشم قبول کیا۔ اور اس مفید تحریک میں انہوں نے عملی حصہ بھی لیا۔ چنانچہ ان کا مناظرۂ تعصب و انصاف، رحم و انصاف، برکھا رُت، اور مثنوی حب وطن وغیرہ اسی مبارک زمانے کی یادگار ہیں:

شروع شروع میں عوام نے جدید شاعری کو تعجب اور دلچسپی کی نظر سے دیکھا۔ لیکن کچھ مدت بعد یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ اس میں عشق و عاشقی اور عشوہ و ناز کے نشتر کہاں تھے۔ جو دلوں کو زخمی کرتے اور عشق کے ساز کو چھیڑ کر اپنے نغموں سے قلوب کو جذب کرتے۔ لیکن پھر بھی امید سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اور ہر

نوجوان شاعر کے دل میں ایک مرتبہ اس طرز میں طبع آزمائی کرنے کا شوق ضرور پیدا ہوا۔ ہر مہینے اس انجمن کے جلسے بڑی دھوم دھام سے ہوتے رہے۔ اور ان کی روئداد اخباروں میں نکلتی رہی۔ اور اکثر چیدہ چیدہ نظمیں بھی چھپیں۔ آخر میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ جلسے کی روئداد اور نظمیں ایک رسالے کی صورت میں باقاعدہ ہر مہینے شائع ہونے لگیں۔ اور ملک کے ہر گوشے سے اس کی مانگ آنے لگی گویا جدید شاعری کا شعلہ لاہور سے بلند ہوا اور بہت جلد اس قدر بلندی پر پہنچا کہ اس کی چمک سارے ہندوستان میں پھیل گئی جس سے لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ لیکن یہ دیکھ کر لکیر کے فقیر چلّا اُٹھے۔ کہ ہیں! یہ کیا بدعت ہے۔

ہنگامۂ غدر نے قدیم شاعری کی شمع کے پروانوں کو تتر بتر کر دیا تھا۔ اور کچھ پتہ نہ تھا۔ کہ کون کہاں پڑا اپنی زندگی کے آخری دن پورے کر رہا ہے۔ اس روشنی سے سب میں بیداری اور جان پیدا ہوگئی۔ بڑے بڑے پرانے بڈھے جو گور میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھے تھے۔ اور اپنے آپ کو اگلے زمانے کی نشانیاں کہتے تھے۔ اپنی اپنی کمر تھام کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کسی نے ڈنڈا سنبھالا کسی نے قلم اُٹھایا۔ کسی نے بقدرِ ہمّت محض زبان ہی کو جنبش دی

غرض سب ایک زبان ہو کر چلّائے کہ آزاد ہماری شاعری کا نام و نشان مٹانا چاہتا ہے۔ کسی نے آزاد کے دین و مذہب پر حملہ کیا۔ کسی نے کہا دیوانہ ہو گیا ہے۔ کسی نے نقرہ کسا۔ فرنگیوں سے مل گیا ہے۔ اور اس طرح سے اپنے اور اپنے باپ کے گناہ معاف کرانا چاہتا ہے۔ کسی نے لکھا میاں آزاد اگر انگریزوں کے نزدیک معزز بننا چاہتے ہو تو کوئی اور کام کرو۔ اُردو ادب کی جڑیں کھوکھلی کرنی کیا ضرور ہیں۔ کہیں سے آواز آئی۔ اگر تمہیں خود اس قسم کی بے سروپا اور بے درد نظمیں لکھنے کا شوق ہے تو گھر بیٹھ کر کہہ لیا کرو اور اپنے شاگردوں کو سُنا کر دل ٹھنڈا کر لیا کرو۔ لوگوں کے ادبی مذاق اور عروس شاعری کو کیوں بگاڑتے ہو۔ یہ اعتراضات تو کسی قدر مہذبانہ کہے بھی جا سکتے ہیں۔ لیکن بعض پُرجوش قدامت پرست لوگ تو اس سے بھی آگے بڑھے۔ اور تہذیب و اخلاق کو بالائے طاق رکھکر بے نُقط سنائیں۔ غرض جا و بے جا حربوں سے آزاد کے جذبۂ شوق اور اُمنگوں کو پائمال کرنا چاہا۔ مدتوں ان کے خلاف اخباروں اور رسالوں میں ہمت شکن مضامین شایع ہوتے رہے اور معاملات حد سے گذرنے لگے۔ آخرکار انجمن کے کارکنوں نے یہی مناسب سمجھا کہ فی الحال جدید شاعری کے مشاعرے بند کر

دیئے جائیں۔ چنانچہ پورے گیارہ مہینے تک یہ مشاعرے جاری رہے اور اس کے بعد بند ہو گئے۔ لیکن باہمت آزاد نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ ان کی پیش بین نظریں عقل کی دُوربین لگائے دیکھ رہی تھیں۔ کہ ملک، زبان اور شعراء کی بہتری اسی میں ہے۔ کہ وہ اپنی شاعری کو مغربی انداز پر ڈالیں۔ ورنہ عنقریب ان کی شاعری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لئے انہوں نے اپنا پروپیگنڈا باقاعدہ جاری رکھا۔ وہ ہر جلسے میں جہاں کہیں بھی ان کو تقریر کا موقعہ ملتا نوجوانوں کو اس طرف متوجہ کرتے۔ ان کی پُرجوش طبیعتوں کو ترقی کی راہیں دکھاتے۔ اور کہتے کہ عشقیہ شاعری میں تم اپنے عزیز وقت کو ضایع نہ کرو۔ تمہارے بزرگ بہت کچھ کہہ گئے ہیں اب اس طرز شاعری میں ترقی کی راہیں مسدود ہیں۔ حقیقی واقعات اور فطری مناظر پر نظمیں لکھو۔ کہ یہ خزانے نہ ختم ہونے والے خزانے ہیں۔ ان میں جذبات کے رنگوں سے جان ڈالو اور مردہ دلوں میں زندگی کی لہریں دوڑاؤ۔

آزاد کی یہ تحریک آخر کار کامیاب ہو کر رہی۔ وہ مخالفت کا طوفان چند مہینوں میں فرو ہو گیا۔ جب مطلع صاف ہوا تو ہر طرف نیچرل شاعری کے چرچے تھے۔ اور ہر شاعر کی زبان پر

کوئی بنجرل نظم تھی۔ حقیقتاً یہ اس نیک نیتی کا پھل تھا۔ کہ جس
کے ساتھ اس مفید تحریک کی ابتدا کی گئی تھی ؛

پنجاب یونیورسٹی کی خدمات

آزاد نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض منصبی و تصنیف و
تالیف کے کاروبار میں ہمہ تن مصروف تھے۔ کہ ۱۸۸۳ء میں یکایک
اس سکون میں تلاطم پیدا ہو گیا[1]۔ اخباروں میں اعلان ہوا کہ
گورنمنٹ تعلیم کے بوجھ سے سبکدوش ہونا چاہتی ہے اور تجویز
یہ ہے کہ گورنمنٹ کالج بھی پنجاب یونیورسٹی کے حوالے کر دیا جائے
ادھر پنجاب یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کی یہ رائے قرار پائی
کہ علوم و فنون ریاضی وغیرہ کی تعلیم محض ترجموں اور امدادی کتب
کے ذریعہ ہو جایا کرے اور فقط انگریزی ادبیات کی تعلیم کے لئے
ایک پروفیسر ڈھائی سو روپے ماہوار پر رکھ لیا جائے۔

جب مولانا آزاد نے اس خبر کو دیکھا تو بجائے اس کے کہ وہ
پریشان ہوتے اور یہ سوچتے کہ جس گھر میں ڈیڑھ سو روپے ماہوار
آتے ہیں۔ جب اس تجویز پر عمل ہوا تو کیا ہو گا۔ وہ اس خبر کو

[1] پنجاب یونیورسٹی ایکٹ ۱۸۸۲ء میں پاس ہوا۔ یہ زمانہ پنجاب کی تعلیمات میں ضرور تلاطم کا زمانہ ہو گا۔

سن کر انتہا درجہ خوش ہوئے کہ اب انہیں تصنیف و تالیف کے کام کے لئے خوب فرصت ملے گی۔ اور دلجمعی سے کام ہو سکے گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دلی دوست میجر سید حسن بلگرامی کو لکھا۔ کہ وہ سرست اس قدر تو نہ ہو گا۔ مگر اتنا ضرور ہو گا۔ کہ یونیورسٹی کے پاس کئی مسجدوں کے ملّانے اور ہندو پنڈت نکمّے بیٹھے ہیں۔ طلباء کو یہ دیسی زبانیں پڑھا لیا کریں گے۔ کالج کے مولوی (پروفیسر عربی) اور پنڈت (پروفیسر سنسکرت) دونو تخفیف۔ تب مولوی (پروفیسر آزاد) کا کیا حال۔ یا گورنمنٹ کوئی عہدہ دے گی۔ اکسٹرا اسسٹنسی؟ مشکل ہے۔ منصفی؟ تحصیلداری؟ شاید پنشن دے دیگی۔ اس میں بھی دو برس کی کمی ہے۔ مگر ہو سکتی ہے۔ خیر ہر بھی تو پچاس روپے سے زیادہ نہیں۔ آسان اور عام قاعدہ یہ ہے کہ مسلسل نوکری ۳۲ برس کی ہے۔ اتنے مہینے کی تنخواہ لو اور سلام۔ اس تجویز کا عمل درآمد اپریل سے ہو گا۔ اب خدا کی درگاہ سے امید ہے کہ تصنیفات کے لئے فرصت کا موقعہ ملا کرے گا۔

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب جہان
آنچہ ما درکار داریم اکثرش درکار نیست" (مکتوبات آزاد ص)

اسی اثنا میں یونیورسٹی کے ایف اے اور بی اے عربی فارسی

کورس مرتب کرنیکا کام ان کے سپرد ہوا۔ یونیورسٹی کے کاموں سے وہ بدظن ہو چکے تھے۔ اس پر انہوں نے اپنے ہمدرد دوست میہر صاحب کو پھر لکھا:۔

"آپ دیکھتے ہیں۔ یہ علم کی چڑیل (پنجاب یونیورسٹی) تعلیم پنجاب کو ہضم کئے جاتی ہے۔ کالج کا بھی کلیجہ کھا چکی ہے۔ چند مہینے میں سن لیجئے گا کہ نگل گئی۔ باوجود اس کے کورس بنانے کے لئے ہم پکڑے جاتے ہیں . . . . . حکم ہے کہ جلدی دو . . . . . اگرچہ کورس کا جھگڑا پیچھے لگ گیا ہے۔ مگر میں مصروف کار ہوں مشکل یہ ہے کہ طبیعت محنت پسند واقع ہوئی ہے۔ انتخاب میں آسان بات یہ ہے۔ کہ کتاب اٹھائی اور لکھ دیا کہ فلاں صفحے سے فلاں صفحے تک۔ مگر اسے دل پسند نہیں کرتا۔ جی چاہتا ہے کہ انتخاب ایسا ہو کہ طلبا کے لئے مفید تعلیم بھی ہو اور پڑھنا اس کا ہر شخص کیلئے باعث شگفتگی بھی ہو۔ البتہ اس میں محنت بہت ہے"

(مکتوبات آزاد ص ۴۹ بجدم)

"کالج کے باب میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ میرا فیصلہ بھی اسی پر منحصر ہے۔ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ سرکار مجھے کوئی نہ کوئی عہدہ دے گی۔ خواہ سررشتہ تعلیم میں خواہ سول لائن میں۔ اخیر درجہ پنشن

گا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے۔ جس گھر میں ۱۵۰ روپے مہینہ آتا ہے۔ اس میں پچاس روپے آئیں گے۔ تو صورت حال کیا ہو گی۔ لیکن دل کی آزادی یہی کہتی ہے۔ کہ قناعت کو رفاقت میں لو۔ تھوڑا کھاؤ اور اپنی کتابوں کو پورا کرو۔ خدائے کریم کارساز ہے۔ وہ دینا چاہے گا۔ تو اس کے ہزاروں ہاتھ ہیں۔ عہدے کے لئے کوشش نہ کرو۔ آپ کی کیا رائے ہے" (مکتوبات آزاد ص ۵۰)

میجر صاحب آزاد کے دل سے قدر دان اور حقیقی ہمدرد تھے ان کے بڑے بھائی حضور نظام کے اتالیق تھے۔ انہوں نے یہ حالات سن کر آزاد کی ہمت بندھائی اور حیدر آباد سے مدد دلوانے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ اس کے جواب میں آزاد نے ان کو یہ الفاظ لکھے:۔

"میرے باب میں جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا۔ دل کو نہایت تشفی اور استقلال حاصل ہوا۔ اپنے جد کے خانہ زادوں کی دستگیری آپ صاحب نہ فرمائیں تو اور کون ہے۔ پروردگار اس خاندان کو اقتدار روز افزوں عطا فرمائے۔ میں نے اپنے دل سے یہ قرار لے لیا ہے۔ کہ اگر اکسٹرا اسسٹنٹی دی تو اختیار کر لوں گا۔ ورنہ پنشن لوں گا۔ اور تھوڑے پر قناعت کروں گا۔ اپنی کتابوں کو تیار کر کے پیشکش کرتا جاؤں گا۔ اور دعائے دولت میں مصروف رہوں گا۔

ہاں جو خدمت فرمائیں گے وہ بھی بجا لاؤں گا۔ کالج کا تغیر نہیں بھی ہوتا تو سمجھ لیجئے کہ میں تو آپ صاحبوں کا ہو چکا ہے

تم سنو یا نہ سنو نالے کئے جاؤں گا درد دل کہنے سے مطلب ہے اثر ہو کہ نہ ہو
حشر پہ وعدۂ دیدار ہے بیٹھ رہا ہوں بھیڑ ہو ویگی رخ یار ادھر ہو کہ نہ ہو"

(مکتوبات آزاد ص ۱۵۱)

اسی سلسلہ میں مولانا آزاد کا ایک اور خط ہے۔ جس کا حوالہ دلچسپی سے خالی نہیں وہ اپنے دوست میجر سید حسن صاحب کو لکھتے ہیں :۔

"نوکری کے باب میں دیکھتا ہوں۔ کہ وہی مایوسی کے کلمے ہیں۔ یونیورسٹی پر آپ مجھے کیوں ڈالتے ہیں۔ یہ ہے کون تعجب! آپ کے جد کی سرکار تو ہے۔ حضرت اس غلام کو آزاد کرکے۔ وہ دست بردار نہیں ہو گی۔ انشاء اللہ آپ دیکھیں گے۔ اس سے بہتر صورت ہو گی اور بدرجہا بہتر ہو گی۔

خوشا بحال آزاد کہ ۵۰ روپے پنشن بھی ہو جائے۔ تو ہزار ہزار شکر خدا کا بجا لائیگا۔ اور بغلیں بجا بجا کر رقص کریگا ہے

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب جہاں آنچہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست

آہا۔ پھر انشاء اللہ کیا خاطر جمع اور سکون طبع کے ساتھ تصنیفات

کو درست کر دوں گا۔"

خدا کی قدرت کہ یہ تجویزیں بحث و تمحیص کے بعد ختم ہو گئیں۔ اور کالج کے کاروبار میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور آزاد سکون قلب کے ساتھ اپنے کاروبارِ تصنیف میں مشغول رہے۔ ہاں اس تحریک کا یہ نتیجہ ضرور برآمد ہوا کہ وہ اکتوبر ۱۸۸۳ء سے یونیورسٹی کے ملازم قرار دیئے گئے۔

آثارِ جنون اور سیاحت ایران ۱۸۸۵ء

دن رات تصنیفات کے کام میں مشغول رہنے سے آزاد کی صحت پر اثر پڑنا شروع ہوا۔ ان کی محنت کی یہ کیفیت تھی کہ دن رات کتابیں لکھنے اور پڑھنے میں مشغول رہتے تھے۔ کئی کئی وقت کھانا بھی نہ کھاتے تھے۔ پھر اس پہ بواسیر کی بھی تکلیف تھی جس سے میروں خون بہ جاتا۔ ادھر صدمات بھی پے در پے گذر رہے تھے۔ وہ پھوپھی جنہوں نے انہیں پالا تھا۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ مسلسل اولادیں ضائع ہو گئیں۔ تمام زندگی میں ان کے ہاں سولہ بچے ہوئے اور ان میں سے محض ایک لڑکا اور ایک لڑکی باقی رہے۔ باقی سب چند سال کے ہو ہو

کے رخصت ہو گئے۔ غرض ان صدمات سے رات کی نیند حرام ہو گئی۔ ساری ساری رات نیند نہ آتی اور تمام رات ٹہلتے ٹہلتے گزارتے۔ آخر تجویز یہ ٹھہری کہ ایران کی سیاحت کی جائے۔ شاید سیاحت سے طبیعت اصلاح پذیر ہو۔ چنانچہ اُنہوں نے چھٹی لے لی اور سفر کا ارادہ کیا۔ احباب اور اعزاء سفر کے نام سے گھبراتے تھے اور کہتے تھے۔ آپ سفر کے شدائد برداشت نہ کر سکیں گے۔ خطرہ ہے کہ کہیں مرض زیادہ نہ بڑھ جائے۔ لیکن آزاد نے کہا میرا علاج یہی ہے میرا دل سفر سے بہلے گا۔ اور طبیعت درست ہو جائے گی۔ آخر وہ سیرِ ایران کے لئے روانہ ہو گئے۔ اور تقریباً ایک سال میں واپس آئے۔ خدا کی مہربانی سے یہ سفر اور سیران کو راس آئی اور بگڑی ہوئی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ ایران سے واپس آکر اُنہوں نے پھر اپنے وہی مشاغل اختیار کر لئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ اب ان کی طبیعت میں پہلے جیسا کام کرنے کا جوش اور دل میں ہمت باقی نہ رہی تھی۔ وہ دوست احباب سے بھی کم ملتے جلتے اور عام طور پر الگ تھلگ رہتے تھے۔

کتب خانۂ آزاد

ایران سے واپس آنے کے بعد انہوں نے ایک کتب خانہ

"کتب خانۂ آزاد" کے نام سے جاری کیا۔ یہ کتب خانہ تمام وکمال ان کی اپنی ملکیت تھا۔ اور اس میں بیش بہا قلمی کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ جو انہوں نے ہندوستان کے گوشے گوشے سے خریدی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ بخارا۔ کابل۔ ایران اور مصر وغیرہ سے بھی بے حد وحساب کتابیں اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس وقت تک لاہور میں کوئی مشرقی کتابوں کا پبلک کتب خانہ نہ تھا۔ اسلئے جب انہوں نے کتب خانہ جاری کرنے کا خیال ظاہر کیا تو حکومت نے ایک قطعہ زمین اکبری دروازہ کے باہر درگاہ شاہ محمد غوث کے پہلو میں اس مفید مقصد کے لئے ان کو دیا۔ اس قطعہ زمین پر آزاد نے اپنی نگرانی میں تقریباً دو ڈھائی ہزار روپیہ صرف کر کے کتب خانہ تعمیر کرایا۔ یہ عمارت اب بھی موجود ہے۔ اسکے پیچھے رہائشی مکان ہے اور سامنے کے رُخ کوٹھی نما عمارت ہے۔ جسمیں کتب خانہ تھا۔ کہتے ہیں جب کتب خانے کی عمارت تعمیر ہو رہی تھی۔ تو وہ بیشتر اوقات اس کی نگرانی میں صرف کرتے تھے۔ برسات کا موسم تھا۔ جب ابر آسمان پر محیط ہوتا تو پریشان ہوکر آسمان کی طرف دیکھتے اور ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر دُعائیں مانگتے کہ یا اللہ بارش نہ ہو۔ اگر بارش ہوئی تو کتب خانے کی تعمیر کا کام

بند ہو جائے گا۔ کبھی بادلوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے کہ بادلو اُڑ جاؤ۔ کہیں اور جا کر برسو۔ آزاد کے کام میں کیوں رخنے ڈالتے ہو۔

سر چارلس ایچیسن لفٹننٹ گورنر نے اس کا بذات خود معائنہ کیا اور سنہ ۱۸۸۸ء کی پنجاب پبلک لائبریری رپورٹ میں اس کا تذکرہ بہت ہی شاندار الفاظ میں فرمایا۔ واقعہ یہ ہے کہ کتب خانہ تمام و کمال قلمی کتب پر مشتمل تھا۔ اور ان میں سے بیشتر کتابیں نایاب تھیں۔

سنہ ۱۸۸۹ء میں مسلسل محنت شاقہ اور روحانی صدمات سے مولانا کے دماغ نے جواب دے دیا۔ اور آخر کار یہ کتب خانہ بند کرنا پڑا۔ کتب خانہ بند ہونے کے بعد حکومت کی طرف سے نوٹس آیا کہ کتب خانہ کھولو۔ لیکن مولانا آزاد کی یہ حالت تھی۔ کہ وہ کسی کو کتب خانے میں قدم رکھنے نہ دیتے تھے۔ حکومت کو ان واقعات سے اطلاع دی گئی۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ عمارت خالی کر دی جائے اور میونسپل کمیٹی وہ رقم ادا کرے جو اس عمارت کی تعمیر میں صرف ہوئی ہے۔ چنانچہ کتب خانہ وہاں سے اپنے ذاتی مکان میں منتقل کر دیا گیا اور کمیٹی نے دو ڈھائی ہزار کی رقم ادا کر کے عمارت پر

قبضہ کر لیا۔

مولانا کی زندگی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے کتب خانہ میں داخل ہو سکے۔ وہ اپنی کتابوں کی جان سے زیادہ احتیاط کرتے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو والد مرحوم نے گورنر پنجاب کے ایماء سے یہ کتب خانہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی نذر کر دیا۔ یونیورسٹی لائبریری میں مولانا کی کتابیں جن الماریوں میں محفوظ ہیں۔ ان پر "آزاد کولکشن" کا لیبل لگا ہوا ہے۔ ان میں سے بعض نایاب کتب پنجاب یونیورسٹی نے طبع بھی کرائی ہیں:

شمس العلماء کا خطاب

۱۸۸۷ء میں ملکۂ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقعہ پر آزاد کو ان کی قابلیت اور سیاسی خدمات کے صلے میں شمس العلماء کا خطاب اور خلعتِ فاخرہ عطا ہوا۔ غالباً یہ خطاب سب سے پہلی مرتبہ انہی کو ملا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے ہمعصروں میں وہ شمس العلماء کا خطاب پانے میں سب کے پیشرو تھے۔ انہی ایام میں مولانا آزاد پنجاب یونیورسٹی کے فیلو بھی مقرر ہوئے[1]

[1] پنجاب یونیورسٹی کیلنڈر بابت ۸۷-۱۸۸۶ء سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہاں

سنہ ۱۸۸۶ء ڈائرکٹر تعلیمات نے ان کی علمی اور سیاسی خدمات کی بنا پر حکومت پنجاب سے سفارش کی تھی۔ کہ ان کو دو ہزار ایکڑ زمین عطا کی جائے یہ کاغذات ضروری احکام کے لئے ابھی گردش ہی میں تھے۔ کہ مولانا کا دماغ اُلٹ گیا اور یہ تحریک ختم ہوگئی۔ کہتے ہیں پنڈت من پھول جو بخارا مشن کے ارکین میں سے تھے۔ وہ اس تجویز کے سخت مخالف تھے۔ اسلئے بارآور نہ ہوسکی۔ بہرحال حکومت نے اتنا ضرور کیا۔ کہ ان کی خدمات پر نظر رکھتے ہوئے ان کو پوری تنخواہ پر پنشن دے دی۔ ورنہ قاعدے کے مطابق انہیں نصف تنخواہ ملنی چاہیئے تھی۔ اس وقت ان کی تنخواہ تقریباً دو سو روپے تھی۔ اور وہ سنہ ۱۸۹۰ء سے لیکر جنوری سنہ ۱۹۱۰ء تک باقاعدہ اسی طرح ملا کی۔

جنون کے اسباب روحانی صدمات

ہم ذکر کرچکے ہیں۔ کہ مولانا آزاد کی صحت تصنیف و تالیف کی

سنہ ۱۸۸۷ء کی کانووکیشن کے حاضرین کی فہرست میں ان کو شمس العلماء لکھا ہے سنہ ۸۶-۱۸۸۷ء کے کیلنڈر میں وہ صرف مولوی محمد حسین ہیں بظاہر فیلو وہ اس سے پہلے مقرر ہوچکے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کیلنڈر بابت سنہ ۸۴-۱۸۸۵ء میں ص ۴۷ پر ان کو فیلو لکھا ہے۔ اسی طرح کیلنڈر بابت سنہ ۸۶-۱۸۸۷ء میں ص ۲۱۷ پر بھی ان کا شمار ان فیلوز میں ہوا ہے۔ جن کا تقرر پنجاب یونیورسٹی ایکٹ سنہ ۱۸۸۲ء کے پاس ہونے کے بعد ہوا

محنت شاقہ اور ۱۴ اولادیں ضایع ہونے سے خراب ہو چکی تھی۔ اس میں سیر و سفر کی کلفتوں کو بھی بہت زیادہ دخل تھا۔ کہ ان دنوں کے سفر سقر کے ہم معنی تھے۔ پھر بواسیر کی تکلیف بھی روزافزوں تھی۔ جس سے سیروں خون ضایع ہوئے جاتا تھا۔ اسی عرصے میں ان کے مکان کو آگ لگی اور میری والدہ کی پالنے والی ملازمہ جل کر خاک ہو گئی۔ اس واقعہ کا ان کے دماغ پر سخت صدمہ ہوا۔ اسی اثنا میں ان کی پیاری بیٹی جس کو انہوں نے خود بہت محنت سے پڑھایا تھا اور تصنیف و تالیف میں وہ ان کو بہت مدد دیتی تھی عنفوانِ شباب میں انتقال کر گئی[1]۔ یہ آخری صدمہ ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ چنانچہ جب یہ ہوشربا خبر پہنچی تو ان کا دماغ بے قابو ہو گیا۔ تجویز یہ پایا کہ وہ پٹیالے جائیں۔ سامانِ سفر باندھ لیا گیا۔ اور وہ نہانے کے لئے غسلخانے میں گئے لیکن مسلسل کئی گھنٹے غسلخانے ہی میں رہے۔ لاکھ دروازے کھٹکھٹائے لیکن نہ کھولے۔ یہاں تک کہ ریل کا وقت گزر گیا۔ غرض دوسرے دن روانہ ہوئے۔ لیکن اس صدمے سے ان کا دماغی توازن بہت ہی زیادہ خراب ہو گیا ٭

---

[1] ان کی شادی خلیفہ سید محمد کاظم رئیس پٹیالہ و ممبر کونسل ریاست سے ہوئی تھی ۱۲

رُوحوں سے بات چیت

ان آخری ایام میں ان کو روحانیات اور اوراد و وظائف کا شوق بہت ہوگیا تھا۔ اتفاق سے کہیں انہیں ایک تختی مل گئی تھی۔ رات کو جب تمام عالم محوِ خواب ہوتا۔ تو وہ اس تختی کی مدد سے رُوحوں کو بُلاتے اور ان سے باتیں کرتے۔ روحیں سوالات کا جواب پنسل سے اس تختی پر لکھ دیتیں۔ مگر یہ ابتدائی باتیں تھیں۔ اب رُوحوں پر انہیں اسقدر قدرت حاصل ہوگئی تھی کہ بغیر کسی خارجی امداد کے خود فرماتے کہ فلاں شخص کی یا فلاں جگہ کی رُوح آئی ہے۔ پہلے خود سوال کرتے۔ پھر تھوڑی دیر بعد خاموش رہ کر اور سوال کرتے، اور کہتے کہ اچھا تو یوں ہے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی روح ان سے کچھ کہہ رہی ہے وہ اسکے جوابات سُنتے ہیں۔ اور سوال کرتے ہیں۔ ان آوازوں کو یا خیالات کو جو اس طرح دل میں پیدا ہوتے تھے یا سچ مچ کوئی آواز ہی آتی تھی۔ وہ اس کو کسی خارجی قوت کا اثر سمجھتے تھے۔

درویشوں سے ارادت اور اُس کا انجام

آزاد کو اس زمانے میں درویشوں سے بھی بہت ارادت ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ اکثر بزرگوں کے مزاروں پر خلوص دل سے حاضر ہوتے تھے! صبح کی سیر میں شاہ محمد غوث کی درگاہ اور داتا گنج بخش وغیرہ کے مزار پر فاتحہ پڑھنا ان کا معمول تھا۔ کہتے ہیں اسی اثنا میں ٹیوں کو کی بستی کے قریب ایک مجذوب فقیر سید بدھن شاہ چشتی تشریف لائے کبھی وہ اچھی خاصی ہوش کی باتیں کرتے تھے۔ اور کبھی عالم جذب ان پر طاری ہو جاتا تھا۔ مولانا کی تقدیر ایک دن سیر کرتے کرتے ادھر جا نکلے۔ سیّد صاحب بہت محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ اسکے بعد مولانا کا معمول ہو گیا۔ کہ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور جو کچھ نذرانہ یا پیش کش لے جاتے شاہ صاحب اسے نہایت خوشی سے قبول فرما لیتے۔ تھوڑی مدت میں راز و نیاز کی پینگیں بڑھنے لگیں اور عقیدتیں بڑھ گئیں ؎

دہلی جانے کا حکم

ایک دن مولانا کالج سے پڑھا کر نکلے تو بجائے گھر آنے کے نویں کوٹ چل دیئے۔ ابھی چند قدم کا فاصلہ تھا کہ سید صاحب موصوف نے نظر اٹھا کر دیکھا اور مسکرائے۔ فرمایا "جا محمد حسین تیرے لئے دہلی کا حکم آیا ہے۔ دلی چلا جا"۔ خدا جانے اس بزرگ کے طرز کلام میں کیا جادو بھرا تھا۔ کہ یہ الفاظ بجلی کی طرح خرمن ہوش و حواس پر گرے، اور حضرت آزاد اسی حال میں پیدل دہلی روانہ ہوگئے۔ پہلے پٹیالے گئے۔ سید جعفے مرحومہ بیٹی کے مکان پر پہنچے۔ وہاں سب ان کا یہ حال دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ کچھ دیر توقف کیا۔ اسکے بعد نظر بچا کر وہاں سے بھی روانہ ہوگئے۔ وہ لوگ سمجھے کہ کسی سے ملنے کے لئے اِدھر اُدھر گئے ہیں۔ غرض جنگلوں اور بیابانوں کو پاؤں پیدل طے کرتے ہوئے دہلی پہنچے، حالت یہ تھی کہ سر سے پگڑی غائب۔ پاؤں میں جوتا ندارد۔ کپڑے پھٹے ہوئے۔ پریشان حال ویران دل۔ آناً فاناً میں دہلی میں شور مچ گیا کہ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد اس حال میں دہلی آئے ہیں۔ ہر شخص دیکھتا تھا۔

اور انگشت بدنداں تھا۔ کہ یہ کیا ہوگیا۔ رشتہ داروں اور عزیز دوستوں کو یقین نہ آتا تھا۔ جب اپنی آنکھوں سے دیکھتے تو بے اختیار روتے تھے۔ منت سماجت کرتے کہ چلو گھر چلو۔ برائے خدا اپنے اور ہمارے حال پر رحم کرو۔ مگر ان باتوں کی کسے پروا تھی۔ کبھی قدم شریف اپنے پیارے اُستاد ذوقؔ کے مزار پر۔ کبھی جنگل میں کبھی شہر میں۔ غرض جہاں طبیعت لے جاتی جا نکلتے۔ بھوک لگتی۔ تو کسی دُکان سے مٹھی بھر چنے اُٹھا کر کھا لیتے۔ لوگ کھانے اور مٹھائیاں پیش کرتے۔ مگر وہ آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ ادھر گھر کا حال سنئے۔ گھر والے سب لاہور میں حیران تھے۔ کہ مولانا کہاں گئے۔ آخر دہلی سے ان ناگہانی واقعات کی خبر آئی۔ تو گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ والد مرحوم چُھٹی لے کر دہلی گئے۔ بہت سمجھایا کہ خدارا گھر چلیئے۔ مگر اُنہوں نے ایک نہ مانی۔ والدِ مرحوم ملازمت سے مجبور تھے۔ اسلئے واپس آنا ضرور تھا۔ کہتے ہیں ایک دو آدمی نگہبانی کے لئے ساتھ لئے اور زبردستی مولانا کو ساتھ لیکر سوار ہوگئے۔ جب جگادھری پہنچے تو مولانا موقعہ پاکر اُتر گئے ہر چند ڈھونڈا کہیں پتہ نہ چلا ایک ملازم کہ خاص ان کی دیکھ بھال کے لئے ملازم رکھا تھا۔ اس کو وہیں اُتار دیا۔ وہ کئی دن تک ڈھونڈتا

رہا۔ لیکن ناکامیاب رہا۔ آخر اس نے خط لکھا۔ اتنے میں دہلی سے اطلاع آئی۔ کہ مولانا پھر دہلی پہنچ گئے ہیں۔ چنانچہ وہ ملازم بھی دہلی پہنچ گیا اور مدتوں ان کے آگے پیچھے سائے کی طرح پھرتا رہا۔

منشی ذکاء اللہ کیساتھ لطیفہ اور اُن کی مہمان نوازیاں

کچھ عرصے بعد جب یہ جذبۂ بے اختیار سکون کی طرف مائل ہوا۔ تو ان کے بچپن کے دوست (شمس العلماء) منشی ذکاء اللہ صاحب کسی نہ کسی طرح مناکر انہیں اپنے دولت کدے پر لے آئے۔ بہت مدت مہمان رکھا۔ اور ہر قسم کی نازبرداریاں کیں۔

انہی دنوں کے متعلق شمس العلماء منشی ذکاء اللہ صاحب کے فرزند مولوی رضاء اللہ صاحب انجینئر بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حجام خط بنانے آیا۔ اور اس نے خط بنانا شروع کیا۔ آزاد وہاں موجود تھے۔ انہوں نے حجام سے کہا ہٹ جا۔ تجھے خط بھی بنانا نہیں آتا۔ یہ کہہ کر قینچی اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ ذکاء اللہ صاحب

نے بھی کہا تم ہٹ جاؤ۔ چنانچہ آزاد نے پہلے ڈاڑھی تراشی اور پھر اُسترا لے کر ذکاء اللہ صاحب کا خط بنایا۔ منشی صاحب نہایت صبر و سکون سے بیٹھے رہے۔ جب کام ختم ہو گیا تو انہوں نے شیشہ میں دیکھا۔ واقعی ڈاڑھی نہایت عمدہ تراشی تھی۔ اور استرے سے خط بھی خوب بنایا تھا۔

جب دوست احباب میں اِس واقعہ کا ذکر آیا۔ تو منشی صاحب سے لوگوں نے کہا۔ کہ بھئی تم نے کمال کیا۔ دیوانے کے ہاتھ میں اُسترا دے کر صبر و سکون سے بیٹھے رہے۔ انہوں نے مسکرا کر کہا۔ مجھے یقین تھا۔ کہ محمد حسین گو دیوانہ سہی۔ لیکن میرا گلا نہیں کاٹے گا۔ اسلئے میرے دل میں ذرّہ بھر بھی تردّد پیدا نہیں ہوا۔ اور میں اطمینان سے بیٹھا خط بنوایا کیا ؎

لاہور کو واپسی

اب طبیعت اور زیادہ سکون پذیر ہو چکی تھی۔ اور وہی سید بدھن شاہ والی حالت ہو گئی تھی۔ کبھی ہوش میں تھے اور کبھی مجذوب تھے۔ چنانچہ والد مرحوم پھر دہلی گئے۔ اور ان کو

اپنے ساتھ لاہور لے آئے۔ یہاں مولانا کا علاج معالجہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ ڈاکٹر اور حکیموں نے دیکھا۔ اور جس قدر ممکن ہو سکا۔ علاج بھی کیا۔ آخر تجویز یہ ہوئی کہ پاگل خانے میں داخل کر دیا جائے۔ شاید وہاں کے ڈاکٹر علاج معالجے میں کامیاب ہوں۔ چنانچہ یہ بھی کیا گیا۔ ایک دن والد مرحوم دیکھنے کے لئے گئے۔ تو اپنے باپ کی حالت ان سے نہ دیکھی گئی۔ صحت پہلے سے زیادہ خراب ہو چکی تھی۔ اور وہاں رکھنے سے کچھ فائدہ بھی مرتب نہ ہوا تھا۔ اسلئے وہ ان کو واپس لے آئے۔

اب مولانا اپنے علیحدہ مکان میں رہنے لگے۔ آس پاس الماریوں میں کتب خانہ سجا دیا گیا۔ اسی کمرے میں ایک طرف پلنگ دوسری طرف ایک چھوٹا سا بوریا۔ اس پر فرش۔ کاغذ قلم دوات قلمدان وغیرہ۔ سب کچھ پاس رکھ کر بیٹھتے۔ صبح و شام دہی پیتے کہ وہ انہیں بہت مرغوب تھا۔ بیدانہ کے موسم میں بیدانہ کثرت سے کھاتے اور انگوروں کے موسم میں سیروں انگور کھا جاتے۔ تربوز اور آم بھی بہت مرغوب تھے۔ غرض کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی۔ اس زمانے میں انہیں سیر کا بھی بہت شوق ہو گیا تھا۔ صبح شام کئی کئی میل باغوں اور جنگلوں میں گردش کرتے۔ سیر میں ہر

درخت اور پتّہ ان کا مخاطب ہوتا۔ کہیں کھڑے ہو کر چپکے چپکے باتیں کرتے۔ کہیں درخت کے نیچے لیٹ کر برداشت کا عمل کرتے پھر آگے بڑھتے۔ راہ میں اگر کوئی ملتا اور سلام کرتا تو اس کا جواب دیتے اور کھڑے ہو کر ہاتھ اُٹھا کر اس کے لئے دُعائے خیر کرتے۔ اگر کوئی طالب علم مل جاتا۔ تو اس کو بھی دُعائیں دیتے۔ وہ اگر کچھ پوچھتا تو اسے بتلا بھی دیتے۔ قاضی فضل حق صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج بیان کرتے ہیں۔ کہ میں نے ایک مرتبہ سہ نثر ظہوری کا ایک باب ان کے سامنے کھول کر پوچھا کہ یہ کس طرح ہے۔ وہ بہت دیر تک اس کے متعلق تقریر کرتے رہے۔ اور مجھے بہت کچھ سمجھایا لیکن اس کے بعد پھر بگڑ گئے اور چل دیئے کہ جاؤ اپنا کام کرو۔

اس زمانے میں ان کو غزلیں اور عشقیہ شعر کہنے کا دوبارہ شوق ہو گیا تھا۔ ان کی بہت سی غزلیں اسی دورِ زندگی کی یادگار ہیں۔ مجھ سے ایک صاحب نے بیان کیا۔ کہ ایک دن مولانا کو انہوں نے باغ میں سیر کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ چلتے چلتے رُکے پھر ایک درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں بیٹھ کر جیب میں سے کاغذ اور پنسل نکالی اور کاغذ پر کچھ لکھا۔ لکھنے کے بعد تھوڑی سی زمین کھودی اور وہ کاغذ اس میں دبا کر چل دیئے

جب کافی دُور نکل گئے۔ تو ہیں لے جاکر وہاں سے کاغذ نکالا۔ اس پر چند شعر لکھے ہوئے تھے۔ غرض اس قسم کے سینکڑوں واقعات سُننے میں آتے ہیں۔ بات یہ ہے۔ وہ حالت جذب میں اکثر اشعار کہتے اور ان کو یہ کہہ کر ہوا میں اُڑا دیتے یا زمین میں دفن کر دیتے اور کبھی دریا میں بہا دیتے کہ جاؤ اُستاد کی خدمت میں جاؤ۔

اسی عالم میں انہوں نے میری سب سے بڑی دو بہنوں کو لکھنا پڑھنا۔ اور ایک عزیزہ کو قرآن شریف با قرأت پڑھنا سکھایا۔ انہیں اپنے پوتے اور پوتیوں سے بہت محبت تھی۔ اگر کسی کے رونے کی آواز زنانے مکان میں سے آتی تو فوراً بیقرار ہوکر اپنے مکان سے باہر نکل آتے۔ اور وہیں سے شور مچاتے۔ میری والدہ کو بُرا بھلا کہتے اور کہتے کہ یہ میرے بچوں کو مار ڈالے گی۔ اگر کوئی بچہ روتا ہُوا ان کے پاس چلا جاتا تو مارے غصے کے آپے سے باہر ہوجاتے اور اکثر لکڑی لے کر مارنے کے لئے زنانے مکان کی طرف آتے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے۔ کہ کبھی مارنے کی نوبت نہیں آئی۔ ہاں زبانی بہت کچھ کہہ ڈالتے۔

اگر بھوک لگتی تو زنانے مکان میں آتے اور جو کچھ ملتا اپنے مکان میں لے جاکر کھاتے اور اگر ایسا نہ کرتے تو ملازم خود ان کو جاکر دے آتا۔ جب زنانے مکان میں آتے تو سب بچے سلام کرتے وہ ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر دُعائیں دیتے۔ اگر کوئی بچہ پڑھتا ہوا ہوتا تو اس کو تھوڑا بہت پڑھا بھی دیتے۔ لکھائی میں اصلاح تو عام طور پر دیا کرتے تھے۔ اور تمام پوتے پوتیاں اپنے اپنے قلم انہیں سے بنوایا کرتے تھے۔ اپنے پوتوں اور پوتیوں کے نام بھی وہی رکھا کرتے تھے۔ چنانچہ سب سے بڑے پوتے کا نام اُستاد ذوق کے بیٹے کے نام پر محمد اسماعیل رکھا تھا۔ جب میں پیدا ہوا۔ تو میری بڑی بہن ان کے پاس گئیں اور جاکر کہا دادا ابا اللہ نے ہمیں ایک اور بھائی دیا۔ انہوں نے فوراً دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور کہا اس کا نام میرے والد کے نام پر محمد باقر ہوگا۔ اس کے بعد سے جب زنانے مکان میں آتے تو فوراً مجھے آن کر کئی کئی بار سلام کرتے اور ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر دُعائیں مانگتے اور کہتے کہ یہ میرے والد کا ہم نام ہے۔ کہتے ہیں بچپن میں ایک دفعہ کسی بہن نے بے دیکھے دروازہ بند کیا اور میری انگلیاں اس میں پس گئیں جب انہیں معلوم ہوا تو مارے غصہ کے لال پیلے ہوگئے۔ بہن

کو بہت بُرا بھلا کہا۔ اور میری اُنگلیوں کو بار بار پھونک پھونک کر دبا تے اور کہتے تھے۔ ارے یہ تو لکھنے پڑھنے کی اُنگلیاں ہیں۔ یہ تو نے کیا غضب کیا۔

یہ وارفتگی کا زمانہ تقریباً بیس سال رہا۔ اس طویل مدت میں نہ تو ان کی ذات سے کسی کو گزند پہنچا اور نہ وہ کسی پر بارِ گراں ہوئے۔ لطف یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی ان کا قلم رُکا نہیں بیٹھا۔ وہ ہمیشہ تصنیف و تالیف میں منہمک رہتے۔ ان کی اس زمانے کی تصنیفات سینکڑوں ہیں۔ لیکن وہ دنیا داروں کے لئے نہیں۔ وہ ان کے اپنے لئے تھیں۔ یہ تمام مسودات نہایت خوشنما لکھے ہوئے ہیں۔ اکثر جگہ کئی کئی رنگوں کی سیاہیاں استعمال کرتے ہیں۔ اور بے حد خوشنما لکھتے ہیں۔ لیکن خیالات وہی عارفانہ اور مجذوبانہ ہیں۔ افسوس کہ ان میں تسلسل نہیں۔ جہاں تسلسل ہے وہاں یہ دقّت ہے کہ اس فلسفہ کو سمجھنے والے نہیں۔ ہندی عجمی، عربی اور یونانی روحانیات کے فلسفوں نے ان تحریروں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے اگر کوئی شخص ان تمام ممالک کے فلسفوں سے واقف ہو تو ممکن ہے کہ وہ کچھ ان سے اخذ کر سکے۔

انتقال

مرنے سے تقریباً چھ مہینے پہلے بواسیر کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی۔ اور مسلسل خون بہے جاتا تھا۔ بواسیر کا مرض دور ہونے کے بعد کمزوری بڑھتی گئی۔ اور ایک وقت وہ آیا کہ انہوں نے کھانا پینا بالکل ترک کر دیا۔ محض چائے پیا کرتے تھے۔ ایک مہینہ اس حال میں گزرا۔ جسم خشک ہو گیا۔ پیٹ کمر سے لگ گیا۔ یہاں تک کہ یکم محرّم سے چائے پینی بھی چھوڑ دی۔ آخر ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو عاشورے کی شب تھی کہ ۸۲ سال کی عمر میں اس جہان فانی سے رحلت کی۔

یہ خبر آناً فاناً میں ہر طرف پھیل گئی اور مولانا کے عقیدتمند جمع ہونے شروع ہو گئے۔ چونکہ صبح کو عاشورہ تھا۔ اسلئے قرار یہ پایا کہ اس دن دفن نہ کیا جائے۔ بلکہ ایک روز اور انتظار کر لیا جائے۔ تاکہ وہ لوگ بھی جنازے میں شریک ہو سکیں جو لاہور سے باہر ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اس عرصے میں دفن کرنے کے مقام کا فیصلہ ہوا۔ صاحب

کمشنر پنجاب سے عمائید شہر نے درخواست کی اور مولانا کو گامے شاہ کے قریب جسے کربلا بھی کہتے ہیں۔ دفن کرنے کی اجازت مل گئی۔ یہ مقام مزار داتا گنج بخش رح سے بالکل قریب ہے۔ کہ ان بزرگ سے مولانا کو کمال ارادت تھی۔

تیسرے دن جنازہ اٹھا۔ ہزاروں کی تعداد میں مخلوق ساتھ تھی۔ اس دن لاہور کے تمام سرکاری دفاتر۔ اور سرکاری و غیر سرکاری مدارس اور کالج بند ہو گئے اور ہزارہا لوگ جنازہ میں شریک ہوئے۔

مولانا کے اکلوتے بیٹے آغا محمد ابراہیم صاحب جو اسوقت منصف تھے۔ انہوں نے سویم کی فاتحہ کے لئے تمام شہر کو مدعو کیا اور تمام امراء اور غرباء شہر کو کھانا کھلایا۔ اس کے بعد کئی ہزار روپے صرف کرکے ان کا مقبرہ بنایا۔ اس پر سونے کا کلس لگوایا۔ اور مقبرہ کا اندرونی حصہ سنگ مرمر سے بنوایا۔ جو ابھی تک موجود ہے ؛

خاص حالات

لباس مولانا آزاد کا لباس بالکل مولویانہ اور قدیمانہ وضع کا

ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ پر کے پائنچے کا لٹھے کا پاجامہ۔ اور لٹھے کا ہی مغلی گریبان کا کرتہ پہننے کے عادی تھے۔ ادھیڑ عمر میں ایک آدھ مرتبہ شوز بھی پہنا۔ لیکن ویسے عام طور پر سلیم شاہی نری کی جوتی پہنا کرتے۔ گرمیوں میں نین سکھ کا انگرکھا پہن کر اس پر سفید نین سکھ کا چغہ، سر پہ چوگوشیہ ٹوپی تن زیبا کی۔ اور اس پر سفید صافہ بائیں جانب سے باندھتے۔ سفید جرابیں پہننے کا بہت شوق تھا۔ اسلئے جرابیں ہمیشہ سفید ہی ہوتی تھیں۔ قدیم وضع کے مطابق گلے میں سفید لٹھے کا رومال بھی باندھتے تھے۔

سردیوں میں پائجامہ کو پنڈلیوں پر لپیٹ کر پشمینے کے ساتھ باندھا کرتے تھے۔ اگر زیادہ سردی ہوتی تو کشمیرے کی نیم آستینیں پہنتے۔ سخت سردیوں میں روئی کا کوٹ بھی پہن لیتے تھے۔ ورنہ نیم آستین پر فرغل پہنتے۔ سر پہ بجائے ململ کے صافے کے سفید یا فاختائی رنگ کا گرم کشمیری صافہ باندھتے۔ پاؤں میں وہی سفید اونی جرابیں اور دیسی جوتا ہوتا۔ کشمیری کام کیا ہوا چغہ بہت زیادہ استعمال کرتے تھے۔ اور گلے میں وہی سفید لٹھے کا رومال۔

لباس میں بڑی وضعداری برتتے تھے۔ تقریباً بیس برس مجنون رہے۔ لیکن شاید کسی شخص نے ان کو سوائے اس لباس

کے کسی اور لباس میں نہ دیکھا ہوگا۔ جب بھی گھر سے باہر نکلتے ہمیشہ اسی لباس میں نکلتے۔ ہاں دیوانہ پن کے زمانے میں اکثر جرابیں نہیں پہنتے تھے۔

تصویر

اس وقت مولانا آزاد کی تین قسم کی تصویریں ملتی ہیں۔ ایک تصویر نما ابا ۱۸۸۰ء یا اس سے ایک آدھ سال پہلے کی ہے۔ اسوقت مولانا کی عمر تقریباً پچاس برس کی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے کوئی تصویر نہیں کھچوائی۔ آخری دو تصویریں بالکل آخری زمانے کی ہیں۔ والد مرحوم اور ان کے عقیدتمندوں نے ہر چند کوشش کی کہ کسی طرح ان کی تصویر اتاری جائے۔ لیکن وہ قابو میں نہ آتے تھے۔ اور عین وقت پر اُٹھ کر بھاگتے تھے۔ لاہور چیف کورٹ میں پلوڈن صاحب چیف جج تھے۔ ان کو مولانا سے کمال عقیدت تھی والد مرحوم چیف کورٹ میں میر منشی تھے۔ ایک دن انہوں نے والد مرحوم سے کہا کہ ہم مولانا کی تصویر اُتروائیں گے۔ تم انہیں کسی بہانے سے یہاں لے آنا۔ چنانچہ والد مرحوم اُن کا چغہ پہلے سے پلوڈن صاحب کی کوٹھی پر چھوڑ آئے۔ ادھر پلوڈن صاحب

نے تمام سامان تیار کر لیا۔ ادھر والد مرحوم نے انہیں بہاتے بہانے
باہر چلنے کے لئے رضا مند کیا - گھر سے نکل کر بلوڈن صاحب
کی کوٹھی کی طرف چلے۔جب کوٹھی قریب آئی تو انہوں نے کہا۔
میاں باوا آپکو بلوڈن صاحب بہت یاد کرتے ہیں - چلئے ان سے
ملیں اور باتوں باتوں میں اُن کی کوٹھی میں پہنچ گئے - انہوں نے مولانا
کو بہانے سے چغہ پہنا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ اور جلدی سے ایک تصویر
بیٹھے ہوئے اُتار لی - اتنے میں مولانا کھڑے ہو گئے - انہوں نے
ایک تصویر اس حالت کی بھی لے لی - وہ تیسری تصویر لینا چاہتے
تھے - کہ ایک دم غصّے کے آثار - ان کے چہرے پر ہویدا ہوئے
اتنے میں انہوں نے تیسری تصویر بھی اُتار لی - اب مولانا آپے
سے باہر ہو چکے تھے - اور سخت ناراض تھے - اس کے بعد وہ وہاں
نہ ٹھہرے اور کوٹھی سے باہر چلے کہ یہ انگریز مجھے کیمرے میں قید
کرتا ہے - میں یہاں ہرگز نہ ٹھہروں گا -
اتفاق کی بات ہے - کہ پہلی دونوں تصویریں بہت
ہی اچھی رہیں - آخری تصویر بھی خوب ہے - لیکن وہ
غصّے کی حالت کی ہے - اس لئے کبھی اس کا بلاک
نہیں بنوایا گیا ؎

پاکیزگی کا خیال

چونکہ مولانا آزاد مولویوں کے خاندان سے اور خود بھی مولوی تھے۔ اسلئے پاکیزگی اور طہارت کا خیال بہت رکھتے تھے وارفتگی کے زمانے میں اگرچہ روزے نہ رکھتے۔ لیکن نماز اکثر باقاعدہ پڑھا کرتے تھے اور طہارت کا خیال اور نجاست کی احتیاط بالکل اسی طرح کرتے تھے جو ایک نمازی اور پرہیزگار کرسکتا ہے والدہ بیان کرتی ہیں۔ کہ وہ عموماً سوتی کا ازار بند استعمال کیا کرتے تھے لیکن اس کی ہڑیں نہ بندھواتے تھے۔ ایک دفعہ بھولے سے میں نے ان کے ازار بند کی ہڑیں باندھ دیں۔ جب انہوں نے دیکھا تو فوراً زنانے مکان میں آئے اور کہا کہ یہ ہڑیں کیوں باندھی ہیں انہیں ابھی کھول دو۔ یہ پاک نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ پانی انہیں سے نہیں گزر سکتا۔

عام طبیعت

آزاد فطرتاً شگفتہ مزاج اور سادہ طبیعت کے تھے۔ اپنے دل میں کسی کی طرف سے برائی نہ رکھتے تھے۔ اگر کوئی شکایت ہوتی

تو صاف صاف بر ملا منہ پر آجاتی۔ اس عادت کی وجہ سے اکثر
لوگ خفا بھی ہو جاتے۔ لیکن وہ کبھی اس بات کی پروا نہ کرتے
اور اپنی طبیعت پر تکدر نہ آنے دیتے۔ طبیعت میں زیادہ تکلّف
نہ تھا۔ جن سے دوستی تھی ان سے بہت زیادہ دوستی اور محبت
تھی۔ جن سے نفرت ہوتی ان سے دل بالکل مکدر ہو جاتا تھا لیکن
پھر بھی ان کے ہاتھوں کسی کو رنج یا تکلیف پہنچنے کی نوبت نہ
آتی تھی۔ وہ ہمیشہ لوگوں کی خطائیں فراخدلی سے بخش دیتے تھے۔
خود نقصان اٹھا لیتے لیکن دوسرے کو نقصان پہنچتا نہ دیکھ
سکتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ اول تو وہ کسی سے بیزار نہ ہوتے
لیکن جب پے در پے مایوسیاں پیش آتیں تو بیزار ہو جاتے اور
آخر کار رنج کے مارے ادھر سے بالکل قطع تعلق کر کے اپنے دل
کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی کوشش کرتے۔ زمانے نے اگرچہ بہت صدمات
پہنچائے تھے۔ لیکن پھر بھی ان کی طبیعت ہمیشہ شگفتہ رہتی تھی۔
حقیقت یہ ہے کہ ان کو اپنے علمی مشاغل اور منصبی مصروفیتوں میں
کبھی ان حادثات کا خیال بھی نہ آتا تھا۔

شاگردوں سے مراعات

مولانا آزاد کو اپنے شاگردوں سے بہت محبت تھی۔ کالج

کے علاوہ جس وقت بھی کوئی کچھ پوچھنے آجاتا۔ اپنے تمام کام چھوڑ کر اسے تعلیم میں مدد دیتے تھے۔ کالج میں جتنی دیر فارغ رہتے طلباء کو عام اجازت تھی کہ وہ ان سے اپنے اسباق میں مدد لیں۔ دو چار طالب علم ہر وقت ان کے دیوان خانے میں رہتے تھے۔ جو طالب علم باہر سے علم حاصل کرنے آتے اور ان کے سرپرست ان کو مولانا کی سرپرستی میں رکھنا پسند کرتے۔ ان کے لئے ایک علیحدہ مکان تھا۔ وہاں وقت بے وقت ان کو جاکر خود دیکھتے اور ان کا ہر طرح کا خیال رکھتے۔ ان مخصوص طالب علموں میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ وہ جیسے مسلمانوں پر مہربان تھے۔ ویسے ہی ہندوؤں سے محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ پھر ہر طالب علم کو وظیفہ دلوانے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ جب یہ شاگرد تعلیم سے فارغ ہو جاتے۔ تو ان کو ملازمت دلوانے کے لئے خود سفارشیں کرتے اور دوسرے لوگوں سے سفارش لینے کی بیدریغ کوششیں کرتے تھے۔

شاگرد جب تعلیم ختم کرنے کے بعد ملازم ہو جاتے تو اکثر ان سے خط وکتابت کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ مولانا آزاد ان کے خطوط کا کمال محبت سے جواب دیتے تھے۔ وہ اکثر کتابوں

اور سکوں کی تلاش میں دیہاتوں اور قصبوں میں جاتے رہتے تھے۔ چونکہ ان کے شاگرد عام طور پر مدرس ہی ہوتے تھے۔ اسلئے اس قسم کی معلومات ان کو انہیں لوگوں کے ذریعے سے پہنچتی تھیں۔ جب کبھی ان کے پاس جانے کا اتفاق ہوتا۔ تو نہایت شفقت سے ان کے مدارس کا بھی معائنہ کرتے۔ اس طرح سے اکثر اپنے شاگردوں کے طالب علموں سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ پھر جب کبھی خط لکھنے کا موقعہ آتا۔ تو اکثر ان طالبعلموں کو بھی دعاؤں سے یاد کرتے۔

مولوی صاحب کا گھوڑا

مولانا کے مکان سے چونکہ کالج دو ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اسلئے کالج جانے کے لیئے انہوں نے ایک گھوڑا رکھ لیا تھا۔ جب کالج جاتے تو خود گھوڑے پر سوار ہو جاتے اور سائیس آگے آگے یا پیچھے پیچھے چلتا اور اِدھر اُدھر دائیں بائیں طالب علم اپنی کتابیں بغل میں دبائے ساتھ ہوتے۔ شہر سے باہر نکلنے کے بعد طالب علم کتابیں کھول لیتے اور مولانا

سے اپنے سبق کے متعلق ضروری باتیں پوچھتے چلتے۔ خاص طور پر امتحان کے دنوں میں طلباء کی تعداد بہت بڑھ جاتی تھی۔ ہر طالب علم کچھ نہ کچھ سوال پوچھتا جاتا تھا۔ اور مولانا برابر ان کے سوالات کے جوابات دیتے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی ضروری سوالات اور ان کے جوابات بتاتے جاتے تھے۔

سالگرہ کی نیاز

مولانا کو اپنی سالگرہ کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ اپنی سالگرہ بڑے شوق سے مناتے تھے۔ سالگرہ کے دن خاص طور پر نہاتے دھوتے، شکرانے کی نماز ادا کرتے، صدقہ سیلا دیتے۔ سات قسم کے پھلوں اور مالیدہ پر نیاز دی جاتی۔ ایک تھال میں یہ تمام چیزیں رکھ کر اس میں چراغ روشن ہوتا۔ اور پھر اسے دریا میں بہا دیا جاتا۔

ان کی پھوپھی جنہوں نے انہیں پالا تھا۔ ان کے پاس سالگرہ کا کلاوہ رہتا تھا۔ وہ اس میں دعائیں پڑھ پڑھ کر گرہ لگاتی تھیں۔ والدہ ان کی زبانی فرماتی ہیں۔ کہ جب غدر ہوا اور سب خاندان گھر سے باہر نکلا تو مولانا آزاد کی پھوپھی نے بھرے گھر

میں سے فقط سالگرہ کا کلاوہ اٹھا کر اپنے دوپٹے کے آنچل میں باندھ لیا تھا۔ کیونکہ وہ سالگرہ کے کلاوہ کا ضائع ہونا بڑی بدشگونی سمجھتی تھیں۔
وہ مانجھ اُلٹنے کے بعد سے انہیں سالگرہ کا احساس جاتا رہا۔

مولانا آزاد کی ایک ہی شادی ہوئی۔ اور ان کی بیوی کا انتقال ان سے پانچ چھ سال قبل ہوا۔ ان کو اپنی بیوی سے محبت بہت تھی۔ کہتے ہیں۔ ان کے انتقال کو تھوڑی سی مدت ہوئی تھی۔ ایک دن دروازے پر کہار ڈولی لے کر آئے اور آواز دی محمد حسین کوتوال کے گھر سے سواری آئی ہے۔ یہ آواز کہیں مولانا کے کان تک جا پہنچی۔ وہ سیدھے اپنے مکان سے نکلے اور بہت تیز رفتار سے زنانہ مکان میں داخل ہوئے۔ محمد حسین کوتوال شہر کی بیوی آگے آگے تھیں اور وہ بیوی بیوی کہتے ہوئے پیچھے پیچھے۔ ہرچند گھر کی عورتوں نے کہا کہ وہ نہیں ہیں وہ تو مرگئیں۔ یہ محمد حسین کوتوال کی بیوی ہیں۔ لیکن انہوں

نے کہا۔ تم سب غلط کہتے ہو۔ یہ تو میری ہوجی ہیں۔ میں انکی شکل ضرور دیکھوں گا۔ تم لوگ مجھے دھوکا دیتے ہو کہ وہ مرگئیں اتنے میں وہ بیچاری پلنگوں کے نیچے چھپ گئیں۔ کہتے ہیں باوجود سب کے سمجھانے کے انہوں نے ایک نہ سُنی۔ اُن کو زبردستی پلنگ کے نیچے سے نکالا اور شکل دیکھی۔ صورت دیکھ کر کہنے لگے۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ تو واقعی وہ نہیں ہیں۔ وہ تو سچ مچ مرچکی ہیں۔ یہ کہہ کر لاحول پڑھتے ہوئے اپنے مکان میں آگئے ⁂

نثر موزوں

اپنے شفیق اُستاد کا کلام انہوں نے نہایت جانفشانی سے مرتب کیا - لیکن افسوس کہ وہ ان کے ہوش و حواس کے زمانہ میں چھپ نہ سکا - والد مرحوم نے احباب کے تقاضوں سے اس کو چھپوایا۔ جب وہ چھپ کر تیار ہوا۔ تو وہ اس کی ایک جلد مولانا آزاد کی خدمت میں لے گئے۔ انہوں نے اس کو بہت شوق سے دیکھا۔ اور ہاتھ اُٹھا کر بہت دیر تک دُعائیں مانگتے رہے والد مرحوم بیان کیا کرتے تھے - میں نے کہا۔ میاں باوا اس پر

کچھ لکھ دیجئے۔ یہ کہہ کر انہوں نے کاغذ قلم دوات آگے رکھ دیا۔ مولانا نے فوراً قلم اٹھا کر ایک پیراگراف لکھ دیا۔ یہ تحریر اُردو ادب میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ والد مرحوم نے اسے "نثر موزوں" کے عنوان سے دیوانِ ذوق کے ساتھ چسپاں کر دیا۔ یہ تحریر ابھی تک اس کے ساتھ چھپتی ہے۔ لوگ اس کو بڑے شوق سے لطف لے لے کر پڑھتے ہیں۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ کہ یہ اس زمانے کی تحریر ہے۔ جب ان کی ادبی موت واقع ہو چکی تھی۔

مولانا آزاد کا مذہب

مولانا آزاد کے بزرگ اور وہ خود شیعہ مذہب رکھتے تھے ان کے مذہب کی بنیاد محمدؐ اور آلِ محمدؐ کی محبت پر تھی۔ ان کا خاندان مولانا محمد باقر تک طرۂ اجتہاد سے سرفراز تھا۔ لیکن مولانا آزاد نے اپنے لئے ایک نیا اور پُرسکون راستہ اختیار کیا تھا۔ جو تعصب کی آلودگی سے پاک تھا۔ اور ان کو عام علماء سے سربلند کرتا تھا۔

دربارِ اکبری میں انہوں نے اپنے اعتقاداتِ مذہبی کے بارے میں متعدد مقامات پر وضاحت فرمائی ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مذہب کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے انہوں نے شیعہ اور سنی دونوں مذہبوں کا مکمل مطالعہ کیا تھا دہلی کالج میں داخل ہونے سے پہلے شیعہ دینیات کی کتابیں اپنے والد سے پڑھی تھیں۔ وہ بھی شیعہ اور سُنّی فقہات سے کما حقہ واقف تھے، اور کالج میں داخل ہونے کے بعد مخصوص حالات کی وجہ سے وہ سُنّی دنیات کی جماعت میں درس لینے پر مجبور کئے گئے تھے۔ اسلئے دونوں فرقوں کی مذہبی کیفیتیں ان پر پوری طرح روشن تھیں۔ یہی سبب تھا کہ ان کے دل میں تعصّب بالکل نہ تھا۔

مولانا آزاد کے مذہب کے بارے میں ہم اپنی طرف سے کچھ نہ لکھیں گے۔ بلکہ جو کچھ انہوں نے اپنے قلم سے مذہب کے متعلق لکھا ہے۔ محض اس کو لکھ کر سلسلہ بیان کو ختم کر دینگے تاکہ ان کے اصلی خیالات آئینہ ہو جائیں:۔

"مذہب[1] کے معاملے میں میرا ایک خیال ہے۔ خدا جانے احباب کو پسند آئے یا نہ آئے۔ ذرا خیال کر کے دیکھو۔ اسلام ایک

[1] دیکھو دربارِ اکبری میں ابوالفیض فیضی کے حالات ۱۲

خدا ایک۔ سُنّی اور شیعہ کا اختلاف ایک منصب خلافت پر ہے جس کے واقعہ کو آج کچھ کم تیرہ سو سال گزر چکے ہیں۔ وہ ایک حق تھا۔ کہ سُنّی بھائی کہتے ہیں کہ جنہوں نے لیا۔ حق لیا۔ شیعہ بھائی کہتے ہیں۔ کہ حق اوروں کا تھا۔ ان کا نہ تھا۔ اگر پوچھیں کہ انہوں نے اپنا حق آپ کیوں نہ لیا؟ جواب یہی دیں گے۔ کہ صبر کیا اور سکوت کیا۔ تم لینے والوں سے بے کر اس وقت دلوا سکتے ہو؟ نہیں۔ لینے والے موجود ہیں؟ نہیں۔ طرفین میں سے کوئی ہے؟ نہیں۔ اچھا جب یہ صورت ہے۔ تو آج تیرہ سو برس کے بعد اس معاملے کو اس قدر طول دینا کہ قوم میں ایک فسادِ عظیم کھڑا ہو جائے۔ چار آدمی بیٹھے ہوں تو صحبت کا مزا جاتا رہے۔ کام چلتے ہوں تو بند ہو جائیں۔ دوستیاں ہوں تو دشمنی ہو جائیں۔ دنیا جو مزرعۂ آخرت ہے۔ اس کا وقت کار ہائے مفید سے ہٹ کر جھگڑے میں جا اُلجھے۔ قوم کی اتحادی قوت ٹوٹ کر چند در چند نقصان گلے پڑ جائیں۔ یہ کیا ضرور ہے بہت خوب۔ تم ہی حق پر سہی۔ لیکن انہوں نے صبر اور سکوت کیا۔ پس اگر تم اُن کے ہو تو تم بھی صبر اور سکوت ہی کرو۔ زبانی بدگوئی اور بدکلامی کرنی اور بھٹیاریوں کی طرح لڑنا کیا عقل ہے۔ اور

کیا انسانیت ہے۔ کیا تہذیب ہے۔ کیا حسن خلق ہے ؟

۱۳ سو برس کے معاملے کی بات ایک بھائی کے سامنے اس طرح کہہ دینی جس سے اس کا دل آزردہ بلکہ جل کر خاک ہو جائے۔ اس میں کیا خوبی ہے۔ میرے دوستو! اوّل ایک ذرا سی بات تھی۔ خدا جانے کن کن لوگوں کے جوش طبع اور کن کن سببوں سے تلواریں درمیان آکر لاکھوں کے خون بہ گئے خیر اب وہ خون خشک ہو گئے۔ زمانہ کی گردش نے پہاڑوں خاک اور جنگلوں مٹی ان پر ڈال دی، ان جھگڑوں کی ہڈیاں اکھیڑ کر تفرقہ کو تازہ کرنا اور اپنایت میں فرق ڈالنا کیا ضرور ہے۔ اور دیکھو اس تفرقہ کو تم زبانی باتیں نہ سمجھو۔ یہ وہ نازک معاملہ ہے کہ جن کے حق کے لئے تم آج جھگڑے کھڑے کرتے ہو۔ وہ خود سکوت کر گئے۔ تقدیری بات ہے۔ اسلام کے اقبال کو ایک صدمہ پہنچنا تھا۔ سو نصیب ہوا۔ فرقہ کا تفرقہ ہو گیا۔ ایک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ پورا نہ زور رہا۔ آدھا آدھا ہو گیا۔ اور دیکھو تم! ۱۳ سو برس کے حق کے لئے آج جھگڑتے ہو؟ نہیں سمجھتے کہ ان جھگڑوں کے تازہ کرنے میں تمہاری تھوڑی جمعیت اور مسکین فرقے میں ہزاروں حقداروں کے حق برباد ہوتے ہیں۔

بنے ہوئے کام بگڑتے ہیں۔ روز گار جاتے ہیں۔ ردیٹیوں سے محتاج ہوتے ہیں۔ آئندہ نسلیں لیاقت اور علم و فضل سے محروم رہ جاتی ہیں۔ میرے شیعہ بھائی اس کا جواب ضرور دیں گے۔ کہ جوش محبت میں مخالفوں کے لئے حرف بد زبان سے نکل جاتے ہیں۔ اس کے جواب میں فقط اتنا سمجھنا کافی ہے۔ کہ عجیب جوش محبت ہے۔ جو دو لفظوں میں ٹھنڈا ہوا جاتا ہے۔ اور عجیب دل ہے جو مصلحت کو نہیں سمجھتا۔ ہمارے مقتداؤں نے جو بات نہ کی۔ ہم کریں۔ اور قوم میں فساد کا منارہ قائم کریں۔ کیا اطاعت اور کیا پیروی ہے ؟

محبت تم جانتے ہو کیا شے ہے۔ ایک الفانی پسند ہے تمہیں ایک شے بھلی لگتی ہے۔ دوسرے کو بھلی نہیں لگتی۔ اسی طرح بالعکس کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جو چیز تمہیں بھاتی ہے۔ وہی سب کو بھائے یہ بات کیونکہ چل سکے گی۔ ابوالفضل ہی نے ایک جگہ کہا ہے اور کیا خوب کہا ہے۔ کہ جو شخص تمہارے خلاف رستے پر چلتا ہے یا حق پر ہے یا ناحق پر۔ اگر حق پر ہے تو احسان مند ہو کر پیروی کرو۔ ناحق پر ہے تو یا بے خبر ہے یا جان بوجھ کر چلتا ہے بیخبر ہے تو اندھا ہے۔ واجب الرحم ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ و۔ جان

بوجھ کر غلط راستے پر چلتا ہے تو ڈرو اور خدا سے پناہ مانگو۔ غصہ کیا۔ اور جھگڑنا کیا؟

میرے باکمال دوستو! میں[1] نے خود دیکھا اور اکثر دیکھا کہ بے لیاقت شیطان جب حریف کی لیاقت اپنی طاقت سے باہر دیکھتے ہیں۔ تو اپنا جتھا بڑھانے کو مذہب کا جھگڑا بیچ میں ڈال دیتے ہیں۔ کیونکہ اس میں فقط دُشمنی ہی نہیں بڑھتی بلکہ کیسا ہی بالیاقت حریف ہو۔ اس کی جمعیت لوٹ جاتی ہے۔ اور شیطانوں کی جمعیت بڑھ جاتی ہے۔ دنیا میں ایسے نافہم بے خبر بہت ہیں۔ کہ بات تو سمجھتے نہیں۔ مذہب کا نام آیا اور آپے سے باہر ہو گئے۔ بھلا دُنیا کے معاملات میں مذہب کا کیا کام؟

ہم سب ایک ہی منزل مقصود کے مسافر ہیں۔ اتفاقاً گذرگاہ دُنیا میں یک جا ہو گئے ہیں۔ رستے کا ساتھ ہے۔ بنابنایا کارواں چلا جاتا ہے۔ اتفاق اور ملنساری کے ساتھ چلو گے۔ رل مل کر چلو گے۔ ایک دوسرے کا بوجھ اُٹھاتے چلو گے۔ ہمدردی

---

[1] ان خیالات کی روشنی میں مولانا محمد باقر اور قاری جعفر علی کے معاملات پر غور کیجئے۔ ساری حقیقت واضح ہو جائے گی ۱۲

سے کام بٹاتے چلو گے تو ہنستے کھیلتے راستہ کٹ جائے گا۔ اگر ایسا نہ کرو گے اور ان جھگڑالوؤں کے جھگڑے تم بھی پیدا کرو گے تو نقصان اُٹھاؤ گے۔ آپ بھی تکلیف پاؤ گے۔ ساتھیوں کو بھی تکلیف دو گے۔ جو مزے کی زندگی خدا نے دی ہے۔ بدمزہ ہو جائے گی۔

مذہب کے معاملے میں انگریزوں نے خوب قاعدہ رکھا ہے ان میں بھی دو فرقے ہیں۔ اور ان میں سخت مخالفت ہے۔ پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک۔ دو دوست۔ بلکہ دو بھائی بلکہ کبھی میاں بیوی کے مذہب بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ وہ ایک گھر میں رہتے ہیں۔ ایک میز پہ کھانا کھاتے ہیں۔ ہنسنا بولنا رہنا سہنا سب ایک جگہ مذہب کا ذکر بھی نہیں اتوار کو اپنی اپنی کتابیں اُٹھائیں۔ ایک ہی بگھی میں سوار ہوئے باتیں چیتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک کا گرجا رستے میں آیا وہ وہاں اُتر پڑا۔ دوسرا بگھی میں بیٹھا اپنے گرجا کو چلا گیا۔ گرجا ہو چکا۔ وہ بگھی میں سوار ہو کر رفیق کے گرجا پہ آیا۔ اسے سوار کر لیا۔ گھر پہنچے۔ اس نے اپنی کتاب اپنی میز پہ رکھ دی۔ اس نے اپنی میز پہ۔ پھر وہی ہنسنا بولنا۔ کاروبار۔ اس کا ذکر بھی

نہیں کہ تم کہاں گئے تھے۔ اور وہاں کیوں نہ گئے تھے۔ جہاں ہم گئے تھے"۔

غدر کے بعد سے انہوں نے عشقیہ شعر و شاعری تقریباً ترک کر دی تھی۔ اکثر جوش طبع کو سلام اور مرثیہ کہنے میں صرف کرتے تھے۔ لاہور میں نواب ناصر علی خاں کی حویلی میں سالانہ مجالس عزا ہوا کرتی تھیں۔ وہاں عشرہ کی آخری تاریخوں میں ایک مرتبہ اپنا کلام پڑھ کر سعادتِ دارین حاصل کرتے تھے۔ کہتے ہیں ایک دو مرتبہ وارفتگی کے زمانے میں بھی اُنہوں نے مجالسِ عزا میں سلام وغیرہ پڑھا تھا۔

آغا محمد باقر۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

(باجازت ایڈیٹر صاحب اورنٹیل کالج میگزین لاہور سے نقل کیا گیا)

فہرست مطالب

امیر خسرو

حضرت امیر خسرؒو کی اَنمل

H.W.

ایک کوئیں پر چار پنہاریاں پانی بھر رہی تھیں امیر خسرؒو
کو رستہ چلتے چلتے پیاس لگی۔ کوئیں پر جا کر ایک سے پانی
مانگا۔ ان میں سے ایک انہیں پہچانتی تھی۔ اس نے اوروں
سے کہا کہ دیکھو کھسرو یہی ہے۔ انہوں نے پوچھا کیا تو
خسرو ہے۔ جس کے سب گیت گاتے ہیں۔ اور پہیلیاں
اور مکرنیاں اَنمل سُنتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہاں۔ اِس پر
ایک ان میں سے بولی کہ مجھے کھیر کی بات کہہ دے۔
دُوسری نے چرخہ کا نام لیا۔ تیسری نے ڈھول۔ چوتھی
نے کُتّے کا۔ انہوں نے کہا کہ مارے پیاس کے دم نکلا
جاتا ہے۔ پہلے پانی تو پلا دو۔ وہ بولیں جبتک ہماری

بات نہ کہدیگا نہ پلائیں گی - انہوں نے جھٹ کہا۔

اَنمِل - کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا۔ آیا کتّا کھا گیا۔ تو بیٹھی ڈھول بجا۔ لا پانی پلا۔

اِسی طرح کبھی کبھی ڈھکوسلا کہا کرتے تھے - کہ وُہ بھی اِنہی کا ایجاد ہے۔

ڈھکوسلا - بھادوں پکّی پیپلی - چو چو پڑی کپاس بی مہترانی دال پکاؤگی - یا ننگا ہی سو رہوں -

دو سخنے :

Two things - . but answer is one

گوشت کیوں نہ کھایا - ڈوم کیوں نہ گایا - گلا نہ تھا۔ جُوتا کیوں نہ پہنا - سنبوسہ کیوں نہ کھایا - تلا نہ تھا - انار کیوں نہ چکھا - وزیر کیوں نہ رکھا - دانا نہ تھا۔

دو سخنے فارسی اُردُو :-

سوداگر راچہ مے باید - بوچے کو کیا چاہیئے - دوکان تشنہ راچہ مے باید - ملاپ کو کیا چاہیئے - چاہ شکار بچہ مے باید کرد - قوتِ مغز کو کیا چاہیئے - بادام

روٹی کھاؤ گھر کو جاؤ۔

نان کہ خوردی خانہ برو

H.W.

سُلطان نظام الدین اولیاء صاحب کے ہاں ایک سیّاح فقیر مہمان آئے۔ رات کو دسترخوان پر بیٹھے۔ کھانے کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ سیّاح نے ایسے دفتر کھولے کہ بہت رات گئی ختم ہی نہ ہوں۔ سُلطان جی صاحب نے کچھ انگڑائیاں کچھ جمائیاں بھی لیں۔ وُہ سادہ لوح کسی طرح نہ سمجھے۔ سُلطان جی صاحب مہمان کی دِل شکنی سمجھ کر کچھ کہہ نہ سکے۔ مجبُور بیٹھے رہے۔ امیر خسرو بھی موجود تھے۔ مگر بول نہ سکتے تھے۔ کہ آدھی رات کی نوبت بجی اس وقت سُلطان جی نے کہا کہ خسرو یہ کیا بجا؟ عرض کی۔ آدھی رات کی نوبت ہے۔ پُوچھا۔ اس میں کیا آواز آتی ہے؟ انہوں نے کہا سمجھ میں تو ایسا آتا ہے۔

نان کہ خوردی خانہ برو۔ نان کہ خوردی خانہ برو
خانہ برو۔ خانہ برو۔

نان کہ خوردی خانہ برو۔ نہ کہ بدستِ تُو کردہ خانہ گرو

خانہ برد - خانہ برد ٭

حرف حرف کی حرکت و سکون پر خیال کرو۔ ایک ایک چوٹ کو کیا پُورا پُورا ادا کر رہے ہیں - اور نہ کہ بدستِ تو کردم خانہ گرد - کو دیکھو۔ اس نے کیا کام کیا ٭

دُھنئے کی تال

ایک دن کسی کُوچہ میں سے گزر ہوا - دُھنیا ایک دُکان میں رُوئی دُھنک رہا تھا۔ کسی نے کہا کہ جس دُھنئے کو دیکھو ایک ہی انداز پر رُوئی دُھنکتا ہے۔ سب ایک ہی اُستاد کے شاگرد ہیں۔ کوئی بولا کہ قدرتی اُستاد نے سب کو ایک ہی انداز پر سکھایا ہے۔ آپ نے کہا کہ سکھایا ہے اور ایک حرکت میں بھی تال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ کوئی بولا کہ لفظوں میں کیونکر لاسکیں - فرمایا۔

در پئے جاناں جاں ہم رفت - جاں ہم رفت - جاں ہم رفت - رفت - رفت - جاں ہم رفت -

ایں ہم رفت۔ آں ہم رفت۔ آنہم رفت۔ آنہم رفت
اینہم۔ آنہم۔ اینہم۔ آنہم رفتا۔
رفتن۔ رفتن۔ رفتن۔ دہ۔ دہ۔ رفتن دہ۔ رفتا۔ رفت
رفتن دہ۔ رفتن دہ۔

شیخ مضمون

پیغمبری وقت

ہائے دِلّی خدا تجھے بہشت نصیب کرے۔ کیسے کیسے لوگ تیری خاک سے اُٹھے اور خاک میں مل گئے۔

اُستاد ذوقؔ مرحوم نے ایک دن فرمایا کہ شیخ مضمونؔ کے زمانہ میں کوئی امیر باہر سے محل میں آئے اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ ایک بڑھیا نئی نوکر ہوئی تھی۔ وہ حُقّہ بھر لائی اور سامنے رکھا۔ نواب صاحب کی زبان پر اِس وقت یہ مضمونؔ کا شعر تھا ؎

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا
صبرِ ایُّوب کیا گریۂ یعقوب کیا

ماما سُن کر بولی - الٰہی تیری امان - اِس گھر میں تو آپ ہی پیغمبری وقت پڑ رہا ہے - بیچارے نوکروں پر کیا گزریگی - چلو بابا یہاں سے -

دِلّی میں غریب مفلس فقیر کسی سے سوال کیا کرتے تھے - تو کہا کرتے تھے - عیالدار ہیں - مُفلس ہیں - ہم پہ پیغمبری وقت پڑا ہے - للہ کچھ دو اور اصل اس کی یہ تھی کہ جس پر سخت مُصیبت پڑتی ہے - وہ زیادہ خدُا کا پیارا ہوتا ہے - اور چونکہ پیغمبر سب سے زیادہ خدُا کے پیارے ہیں - اس لئے اُن پر زیادہ مُصیبتیں پڑتی ہیں - جو مُصیبتیں پیغمبروں پر پڑی ہیں - وہ دوسرے پر نہیں پڑیں - رفتہ رفتہ پیغمبری وقت اور پیغمبری مصیبت کے معنے سخت مُصیبت کے ہو گئے -

دیکھو ایسی ایسی باتیں اُس زمانہ میں کس قدر عام تھیں کہ بڑھیا عورتیں اور مامائیں اُن سے نکتے اور لطیفے پیدا کرتی تھیں -

اب اللہ ہی اللہ ہے ❖

Except God no one knows anything

حاضر جوابی

ایک دن راجہ صاحب کے دربار میں اشرف علی خاں فغاںؔ نے غزل پڑھی۔ جس کا قافیہ تھا لالیاں اور جالیاں۔ سب سخن فہموں نے بہت تعریف کی۔ راجہ صاحب کی صحبت میں جگنو میاں ایک مسخرے تھے۔ اُن کی زبان سے نکلا کہ نواب صاحب سب قافئے آپ نے باندھے مگر تالیاں رہ گئیں۔ انہوں نے ٹال دیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ راجہ صاحب نے خود فرمایا کہ نواب صاحب! سُنتے ہو؟ جگنو میاں کیا کہتے ہیں؟ اُنہوں نے کہا کہ مہاراج اِس قافیہ کو مبتذل سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور حضور فرمائیں تو اب بھی ہو سکتا ہے۔ مہاراج نے کہا کہ ہاں کچھ کہنا تو چاہیئے۔ اُنہوں نے اسی وقت پڑھا ؎

جگنو میاں کی دُم جو چمکتی ہے رات کو
سب دیکھ دیکھ اُس کو بجاتے ہیں تالیاں

تمام دربار چمک اُٹھا۔ اور میاں جگنو مدھم ہو کر رہ گئے۔

لطافتِ مزاج

ایک دن درزی ٹوپی سی کر لایا۔ اس کی تراشش ٹیڑھی تھی۔ اس وقت دوسری ٹوپی موجود نہ تھی۔ مرزا جان جاناں مظہر کو اس لئے اسی کو پہننا پڑا۔ مگر سر میں درد ہونے لگا۔

نقل۔ جس چارپائی میں کان ہو۔ اس پہ بیٹھا نہ جاتا تھا۔ گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ چنانچہ دلی دروازہ کے پاس ایک دن مرزا جان جاناں ہوادار میں سوار چلے جاتے تھے۔ راہ میں ایک بنئے کی چارپائی کے کان پہ نظر جا پڑی۔ وہیں ٹھیر گئے اور جب تک اس کا کان نہ نکلوایا آگے نہ بڑھے۔

نقل۔ ایک دن ایک نواب صاحب جو کہ مرزا صاحب کے خاندان کے مُرید تھے۔ مُلاقات کو آئے اور خود

صراحی لے کر پانی پیا۔ اتفاقاً آبخورا جو رکھا تو ٹیڑھا۔ مرزا
کا مزاج اس قدر برہم ہوا کہ ہرگز ضبط نہ ہو سکا اور بگڑ
کر کہا۔ کمبخت بیوقوف احمق تھا۔ جس نے تمہیں نواب
بنا دیا۔ آبخورا کبھی صراحی پر رکھنا نہیں آتا ۔

نقل - مولوی غلام یحییٰ فاضل جلیل بہ ہدایت غیبی
مرزا کے مرید ہونے کو دلی میں آئے ان کی ڈاڑھی بہت
بڑی اور گھن کی تھی۔ جمعہ کے دن جامع مسجد میں ملے اور
ارادہ ظاہر کیا۔ مرزا نے ان کی صورت کو غور سے
دیکھا اور کہا کہ اگر مجھ سے آپ بیعت کیا چاہتے ہیں
تو پہلے ڈاڑھی کو ترشوا کر صورت بھلے آدمیوں کی
بنا لیجئے۔ پھر تشریف لائیے۔ اللہ جمیل و یحب الجمال۔
(خدا خوبصورت ہے اور خوبصورتی پسند کرتا ہے) بھلا
یہ ریچھ کی سی صورت مجھ کو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ تو
خدا کو کب پسند آئے گی۔ ملا متشرع آدمی تھے۔ گھر
میں بیٹھ رہے۔ تین دن تک برابر خواب میں دیکھا
کہ بغیر مرزا کے تمہارا عقدۂ دل نہ کھلے گا۔ آخر

as if you shaved ... days ago

بیچارے نے ڈاڑھی حجّام کے سُپرد کی اور جیسا خشخاسی خط مرزا صاحب کا تھا۔ ویسا ہی رکھ کر مُریدوں میں داخل ہوئے ۔

سوداؔ کی تنک مزاجی

جب سوداؔ کے کلام کا شہرہ عالمگیر ہُوا۔ تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لئے دینے لگے۔ اور فرمائشیں کرنے لگے۔ ایک دن کسی غزل کے لئے تقاضا کیا۔ سوداؔ نے عذر بیان کیا۔ حضُور نے فرمایا۔ بھئی مرزا کے غزلیں روز کہہ لیتے ہو؟ مرزا نے کہا۔ پیر و مُرشد جب طبیعت لگ جاتی ہے۔ دو چار شعر کہہ لیتا ہوُں۔ حضُور نے فرمایا بھئی ہم تو پائخانہ میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ حضُور ویسی بُو بھی آتی ہے۔ یہ کہہ کر چلے آئے۔ بادشاہ نے پھر کئی دفعہ بلا بھیجا اور کہا کہ ہماری غزلیں بناؤ۔ ہم تمہیں ملک الشعراء کر دیں گے۔

یہ نہ گئے اور کہا کہ حضور کی ملک الشعرائی سے کیا ہوتا ہے
کریگا تو میرا کلام ملک الشعراء کریگا ٭

سوداؔ کی ہجو گوئی

گرمی کلام کے ساتھ ظرافت جو ان کی زبان سے ٹپکتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ بڑھاپے تک شوخیٔ طفلانہ ان کے مزاج میں امنگ دکھاتی تھی۔ مگر ہجوؤں کا مجموعہ جو کلیات میں ہے۔ اس کا ورق ورق ہنسنے والوں کے لئے زعفران زار کشمیر کی کیاریاں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت کی شگفتگی اور زندہ دِلی کسی طرح کے فکر و تردد کو پاس نہ آنے دیتی تھی۔ گرمی اور مزاج کی تیزی بجلی کا حکم رکھتی تھی اور اس شدّت کے ساتھ کہ نہ کوئی انعام اسے بجھا سکتا تھا نہ کوئی خطرا سے دبا سکتا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ تھا۔ کہ ذرا سی ناراضی میں بے اختیار ہو جاتے تھے۔ کچھ اور بس نہ چلتا تھا۔ جھٹ ایک ہجو کا طومار تیار کر دیتے تھے۔

غنچہ نام ان کا ایک غلام تھا۔ ہر وقت خدمت میں رہتا تھا۔ اور ساتھ قلمدان لئے پھرتا تھا۔ جب کسی سے بگڑتے تو فوراً پکارتے۔ ارے غنچہ لا تو قلمدان۔ ذرا میں اس کی خبر تو لوں۔ یہ مجھے سمجھا کیا ہے۔ پھر شرم کی آنکھیں بند اور بے حیائی کا منہ کھول کر وہ وہ بے نقط سناتے تھے۔ کہ شیطان بھی امان مانگے ۔

میرؔ اور سوداؔ کا فرق

ایک دن لکھنؤ میں میرؔ اور سوداؔ کے کلام پر دو شخصوں میں تکرار نے طول کھینچا۔ دونو خواجہ باسط کے مرید تھے۔ اُنہیں کے پاس گئے اور عرض کی کہ آپ فرمائیں اُنہوں نے کہا کہ دونو صاحب کمال ہیں۔ مگر فرق اتنا ہے کہ میرؔ صاحب کا کلام آہ ہے۔ اور مرزا کا کلام واہ ہے۔ مثال میں میر صاحب کا شعر پڑھا ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو - ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

پھر مرزا کا شعر پڑھا ؎

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت
خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے!

لطیفہ در لطیفہ:- ان میں سے ایک شخص جو مرزا کے طرفدار تھے۔ وہ مرزا کے پاس بھی آئے اور سارا ماجرا بیان کیا۔ مرزا بھی میر صاحب کے شعر کو سن کر مسکرائے اور کہا کہ شعر تو میر صاحب کا ہے مگر درد خواہی ان کی دوا کی معلوم ہوتی ہے ۔

ایک دن سودا تو بیخبر گھر میں بیٹھے تھے۔ ان کے حریف مرزا فاخر کے شاگرد بلوہ کرکے چڑھ آئے۔ مرزا کے پیٹ پر چھری رکھ دی اور کہا جو کچھ تم نے ہمارے اُستاد کے متعلق کہا ہے وہ سب لو اور ہمارے اُستاد کے سامنے چل کر فیصلہ کرو۔ مرزا کو مضامین کے کُل

پھول اور پاتوں کے طوطے مینا تو بہت بنانے آتے تھے۔
مگر یہ مضمون ہی نیا تھا۔ سب باتیں بھول گئے۔ بچارے
نے جزدان غلام کو دیا۔ خود میانے میں بیٹھے اور اُن کے
ساتھ ہوئے۔ گرد لشکر شیطان تھا۔ یہ بیچ میں تھے۔ چوک
میں پہنچے تو اُنہوں نے چاہا کہ یہاں اُنہیں بے عزّت
کیجئے۔ کچھ تکرار کر کے پھر جھگڑنے لگے۔ مگر جسے خدا عزّت
دے۔ اُسے کون بے عزّت کر سکتا ہے۔ اتفاقاً
سعادت علیخاں کی سواری آ نکلی۔ مجمع دیکھ کر ٹھیر گئے۔
اور حال دریافت کر کے سودا کو اپنے ساتھ ہاتھی پر بٹھا
کر لے گئے۔ آصف الدولہ حرم سرا میں دسترخوان پر
تھے۔ سعادت علی خاں اندر گئے اور کہا کہ بھائی صاحب
بڑا غضب ہے۔ آپ کی حکومت! اور شہر میں یہ قیامت۔
آصف الدولہ نے کہا۔ کیوں بھئی خیر باشد۔ اُنہوں نے
کہا کہ مرزا رفیع جس کو باواجان نے برادرِ من اور مشفق
مہربان کہہ کر خط لکھا۔ آرزوئیں کر کے بلایا اور وہ نہ
آیا۔ آج وہ یہاں موجود ہے۔ اور اس حالت میں ہے
کہ اگر اس وقت میں نہ پہنچتا۔ تو شہر کے بدمعاشوں نے

اس بیچارے کو بے حرمت کر ڈالا تھا۔ پھر سارا ماجرا بیان کیا۔

آصف الدولہ فرشتہ خصال گھبرا کر بولے کہ بھئی مرزا فاخر نے ایسا کیا۔ تو مرزا کو کیا گویا ہم کو بے عزت کیا باوا جان نے انہیں بھائی لکھا تو وہ ہمارے چچا ہوئے۔ سعادت علی خاں نے کہا کہ اس میں کیا شبہ ہے! اسی وقت باہر نکل آئے۔ سارا حال سنا۔ بہت غصے ہوئے اور حکم دیا کہ شیخ زادوں کا محلہ کا محلہ اکھڑوا کر پھینک دو۔ اور شہر سے نکلوا دو۔ مرزا فاخر کو جس حال میں ہو۔ اسی حال سے حاضر کرو۔ سودا کی نیک نیتی دیکھنی چاہیئے۔ ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ جناب عالی! ہم لوگوں کی لڑائی کاغذ قلم کے میدان میں آپ ہی فیصل ہو جاتی ہے۔ حضور اس میں مداخلت نہ فرمادیں۔ غلام کی بدنامی ہے۔ جتنی مدد حضور کے اقبال سے پہنچی ہے وہی کافی ہے۔ غرض مرزا رفیع باعزاز و اکرام وہاں سے رخصت ہوئے۔ نواب نے احتیاطاً سپاہی ساتھ کر دیئے۔

حریفوں کو جب یہ راز کھلا تو امرائے دربار کے پاس

دوڑے ۔ صلاح ٹھیری کہ معاملہ روپیہ یا جاگیر کا نہیں تم سب مرزا فاخر کو ساتھ لیکر مرزا رفیع کے پاس چلے جاؤ اور خطا معاف کروالو۔

دُوسرے دن آصف الدولہ نے سر دربار مرزا فاخر کو بھی بُلایا اور کہا کہ تمہاری طرف سے بہت نازیبا حرکت ہوئی۔ اگر شعر کے مرد میداں ہو تو آب رُو برو سودا کے ہجو کہو ؂

شیرِ خُدا

آصف الدولہ ایک دفعہ شکار کو گئے ۔خبر آئی کہ نواب نے بھیلوں کے جنگل میں شیر مارا ۔ باوجودیکہ ہمیشہ انعام و اکرام کے انباروں سے زیر بار تھے ۔ مگر فوراً کہا ؂

یارو یہ ابن مُلجم پیدا ہوا دوبارہ
شیرِ خُدا کو جس نے بھیلوں کے بن میں مارا

نواب کو بھی خبر ہوئی ۔ جب پھر کر آئے ۔ تو خود شکایت

دوستانہ کے طور پر کہا کہ مرزا تم نے ہم کو شیرِ خُدا کا قاتل بنایا؟ ہنس کر کہا کہ جناب عالی شیر تو اللہ ہی کا تھا۔ نہ حضور کا نہ فدوی کا۔

آصف الدولہ مرحُوم کی اَنّا کی لڑکی خورد سال تھی۔ نواب فرشتہ سیرت کی طبیعت میں ایک تو عمُوماً تحمُّل اور بے پروائی تھی۔ دوسرے اس کی ماں کا دُودھ پیا تھا۔ ناز برداری نے اس کی شوخی کو شرارت کر دیا۔ ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ نواب سوتے تھے۔ ایسا غُل مچایا کہ بدخواب ہو کر جاگ اُٹھے۔ بہت جھنجھلائے اور خفا ہوتے ہوئے باہر نکل آئے۔ سب ڈر گئے کہ آج نواب کو غُصّہ آیا ہے۔ خُدا خیر کرے۔ باہر آ کر حکم دیا کہ مرزا کو بُلاؤ۔ مرزا اُسی وقت حاضر ہُوئے۔ فرمایا بھئی مرزا! اِس لڑکی نے مجھے بڑا حیران کیا ہے۔ تم

اِس کی ہجو کہہ دو۔ یہاں تو ہر وقت مصالہ تیار تھا۔
اُسی وقت قلمدان لے کر بیٹھ گئے۔ اور مثنوی تیار کر دی
کہ ایک شعر اُس کا لکھتا ہُوں ؎

لڑکی وُہ لڑکیوں ہیں جو کھیلے
نہ کہ لونڈوں میں جا کے ڈنٹر پیلے

بعض بزرگوں سے یہ بھی سُنا ہے کہ دِلّی میں نالہ پر
ایک دوکان میں بھٹیاری رہتی تھی۔ وہ آپ بھی لڑاکا
تھی۔ مگر لڑکی اُس سے بھی سوا چنچل ہُوئی۔ آتے جاتے
جب دیکھتے لڑتے ہی دیکھتے۔ ایک دن کچھ خیال
آ گیا۔ اس پر یہ ہجو کہی ٭

اُمیدوار

شیخ قائم علی ساکن اٹاوہ ایک طبّاع شاعر تھے۔
کمال اشتیاق سے مقبولؔ نبی خاں کے ساتھ بارادہ
شاگردی سوداؔ کے پاس آئے اور اپنے اشعار سُنائے

آپ نے پوچھا تخلّص کیا ہے؟ کہا اُمیدوار مُسکرائے اور فرمایا ؎

ہے فیض سے کسی کے شجر اُن کا باروار
اِس واسطے کیا ہے تخلّص اُمیدوار

بیچارے شرمندہ ہو کر چلے گئے۔ قائم تخلّص اختیار کیا۔ اور کسی اور کے شاگرد ہوئے۔

جب عورت حاملہ ہوتی ہے۔ تو عورتوں کے محاورہ میں کہتے ہیں کہ اُمیدواری ہے۔ یا اللہ کی درگاہ سے اُمید ہے ؎

ایک دن میاں ہدایت مُلاقات کو آئے بعد رسُوم معمولی کے سودا نے پُوچھا کہ فرمائیے میاں صاحب آج کل کیا شغل رہتا ہے۔ اُنھوں نے کہا۔ افکارِ دُنیا فرصت نہیں دیتے۔ طبیعت کو ایک مرض یاوہ گوئی

کا لگا ہوا ہے۔ گاہے ماہے غزل کا اتفاق ہو جاتا ہے۔ مرزا ہنس کر بولے کہ غزل کا کیا کہنا کوئی ہجو کہا کیجئے۔ بیچارے نے حیران ہو کر کہا کہ ہجو کس کی کہوں؟ آپ نے کہا کہ ہجو کو کیا چاہیئے۔ تم میری ہجو کہو۔ میں تمہاری ہجو کہوں ۔

ولایتی کی ہجو

ایک ولایتی نے کہ زمرہ اہل سیف میں معزز ملازم تھا۔ عجب تماشا کیا۔ یعنی سودا نے اس کی ہجو کہی اور ایک محفل میں اس کے سامنے ہی پڑھنی شروع کر دی ولایتی بیٹھا سنا کیا۔ جب ہجو ختم ہوئی۔ اُٹھ کر سامنے آ بیٹھا اور ان کی کمر پکڑ کر مسلسل و متواتر گالیوں کا جھاڑ باندھ دیا۔ انہیں بھی ایسا اتفاق آج تک نہ ہوا تھا۔ حیران ہو کر کہا کہ خیر باشد! خیر باشد! جناب آغا اقسام این مقالات شایان شان شما نیست۔

ولایتی نے ہتیش قبض کمر سے کھینچ کر ان کے پیٹ پر رکھ دی اور کہا نظم خودت گفتی حالا این نثر را گوش کن ۔ ہر چہ تو گفتی نظم بود نظم از مانمے آید ما بہ نثر ادا کردیم ۔

سیّد انشاء کی نوجوانی

سیّد انشاء کا عالم نوجوانی تھا۔ مشاعرہ میں غزل پڑھی ؎

جھڑکی سہی ادا سہی چین جبیں سہی
سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

جب یہ شعر پڑھا کہ ؎

گر نازنیں کہے سے برا مانتے ہو تم
میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی

سودا کا عالم پیری تھا۔ مشاعرہ میں موجود تھے۔ مسکرا کر بولے۔ دریں چہ شک ۔

ہائے افسوس

ایک دن سودا مشاعرہ میں بیٹھے تھے۔ لوگ اپنی اپنی غزلیں پڑھ رہے تھے۔ ایک شریف زادے کی ۱۲-۱۳ برس کی عمر تھی۔ اُس نے غزل پڑھی۔ مطلع پڑھا۔

ع دِل کے پھپھولے جل اُٹھے سینہ کے داغ سے
اِس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

گرمیٔ کلام پر سودا بھی چونک پڑے۔ پُوچھا یہ مطلع کس نے پڑھا ہے لوگوں نے کہا حضرت یہ صاحبزادہ ہے۔ سودا نے بھی بہت تعریف کی۔ کئی مرتبہ پڑھوایا اور کہا کہ میاں لڑکے جوان تو ہوتے نظر نہیں آتے۔ خدا کی قدرت انہی دنوں میں لڑکا جل کر مر گیا۔

میر دردؔ کی بے نیازی

خواجہ میر دردؔ

اگلے وقتوں کے لوگ خوش اعتقاد بہت ہوتے تھے۔

اسی واسطے جو لوگ اللہ کے نام پر توکّل کر کے بیٹھ رہتے تھے۔ اُن کی سب سے اچھی گُذر جاتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ خواجہ میر درد صاحب کو نوکری یا دِلّی سے باہر جانے کی ضرورت نہ ہوئی۔ دربار شاہی سے بزرگوں کی جاگیریں چلی آتی تھیں۔ امیر غریب خدمت کو سعادت سمجھتے تھے یہ بے فکر بیٹھے اللہ اللہ کرتے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ نے خود ان کے پاس آنا چاہا اور اُنھوں نے قبول نہ کیا۔ مگر ماہ بماہ ایک معمولی جلسہ اہل تصوّف کا ہوتا تھا۔ اس میں بادشاہ بے اطلاع چلے آتے۔ اِتفاقاً اس دن بادشاہ کے پاؤں میں درد تھا۔ اس لئے ذرا پاؤں پھیلا دیا۔ اُنھوں نے کہا یہ امر فقیر کے آداب محفل کے خلاف ہے۔ بادشاہ نے عذر کیا کہ معاف کیجئے۔ عارضہ سے معذور ہوں۔ اُنھوں نے کہا کہ عارضہ تھا تو تکلیف کرنی کیا ضرور تھی۔

خواجہ میر درد اور موسیقی

موسیقی میں اچھی مہارت تھی۔ بڑے بڑے باکمال

گویّے اپنی چیزیں بنظر اصلاح لاکر سُنایا کرتے تھے۔ راگ ایک پُر تاثیر چیز ہے۔ فلاسفۂ یونان اور حکمائے سلف نے اسے ایک شاخ ریاضی قرار دیا ہے۔ دل کو فرحت اور رُوح کو عروج دیتا ہے۔ اس واسطے اہل تصوّف کے اکثر فرقوں نے اسے بھی عبادت قرار دیا ہے۔ چنانچہ معمول تھا کہ ہر مہینے کی دُوسری اور ۲۴ کو شہر کے بڑے بڑے کلاونت۔ ڈُوم۔ گویئے۔ اور صاحب کمال اور اہلِ ذوق جمع ہوتے تھے۔ اور معرفت کی چیزیں گاتے تھے۔ یہ دن اِن کے کسی بزرگ کی وفات کے ہیں۔ مُحرّم غم کا مہینہ ہے۔ اس میں ۲ کو بجائے گانے کے مرثیہ خوانی ہوتی تھی۔ مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کا گھرانا اور یہ خاندان ایک محلہ میں رہتے تھے۔ اس زمانہ میں شاہ صاحب عالم طفولیت میں تھے۔ ایک دن اُس جلسہ میں چلے گئے۔ اور خواجہ صاحب کے پاس جا بیٹھے۔ اُن کی مُرید بہت سی کنچنیاں بھی تھیں۔ اور چونکہ اسوقت رخصت ہُوا چاہتی تھیں۔ اس لئے سب سامنے حاضر تھیں۔ باوجودیکہ مولوی صاحب اس وقت بچّہ تھے۔

مگر اُن کا تبسّم اور طرزِ نظر دیکھ کر خواجہ صاحب اعتراض کو پا گئے۔ اور کہا کہ فقیر کے نزدیک تو یہ سب ماں بہنیں ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ ماں بہنوں کو عوام النّاس میں لے کر بیٹھنا کیا مناسب ہے۔ خواجہ صاحب خاموش رہے ؎

خواجہ میر درؔد کے ہاں ایک صحبت خاص ہوتی تھی۔ اس میں خواجہ صاحب نالۂ عندلیب یعنی اپنے والد کی تصنیفات اور اپنے کلام کچھ کچھ بیان کرتے تھے۔ ایک دن مرزا رفیع سے سرِراہ مُلاقات ہوئی۔ خواجہ صاحب نے تشریف لانے کے لئے فرمائش کی۔ مرزا نے کہا۔ صاحب مجھے یہ نہیں بھاتا۔ کہ سو کوّے کائیں کائیں کریں۔ اور بیچ میں ایک پدّا بیٹھ کر چوں چوں کرے۔ اس زمانہ کے بزرگ ایسے صاحب کمالوں کی بات کا

تحمل اور برداشت کرنا لازمۂ زندگی سمجھتے تھے۔آپ مُسکرا کر چُپکے ہو رہے ٭

خواجہ میر دَرد سے سَودا کی عقیدت

ایک شخص لکھنؤ سے دِلّی چلے۔ مرزا رفیع کے پاس گئے اور کہا کہ دِلّی جاتا ہوں۔کسی یار آشنا کو کچھ کہنا ہو تو کہہ دیجئے۔ مرزا بولے کہ بھائی میرا دِلّی میں کون ہے۔ ہاں خواجہ میر دَرد کی طرف جا نِکلو تو سلام کہہ دینا۔ ذرا خیال کرکے دیکھو مرزا رفیع جیسے شخص کو دِلّی بھر میں (اور دلّی بھی اُس زمانہ کی دِلّی) کوئی آدمی معلوم نہ ہُوا۔ اِللّٰہ۔ کیا کیا جواہر تھے۔ اور کیا کیا جوہری ٭

سوز کے تخلُّص پر لطیفہ

سوز مرحوم پہلے میر تخلُّص کیا کرتے تھے۔ جب میر تقی مرحوم میر کے تخلُّص سے عالمگیر ہوئے۔ تو اُنہوں نے سوز اختیار کیا۔ کسی شخص نے سوز سے آکر کہا کہ

حضرت! ایک شخص آپ کے تخلُّص پر آج ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ سوز گوز کیا تخلّص رکھا ہے۔ ہمیں پسند نہیں۔ اُنہوں نے کہنے والے کا نام پُوچھا۔ اس نے بعد بہت سے انکار اور اصرار کے بتایا۔ معلوم ہوُا کہ شخص موصُوف بھی مشاعرہ میں ہمیشہ آتے ہیں۔ میر سوز مرحوم نے کہا خیر کچھُ مضائقہ نہیں۔ اب کے صحبتِ مشاعرہ میں تم مُجھ سے برسرِ جلسہ یہی سوال کرنا۔ چنانچہ اُنہوں نے ایسا ہی کیا اور بآوازِ بلند پُوچھا حضرت آپ کا تخلُّص کیا ہے؟ اُنہوں نے فرمایا کہ صاحب قبلہ فقیر نے تخلُّص تو میر کیا تھا۔ مگر وہ میر تقی صاحب نے پسند فرمایا۔ فقیر نے خیال کیا کہ ان کے کمال کے سامنے

میرا نام نہ روشن ہو سکے گا۔ ناچار سوزؔ تخلّص کیا۔ (شخص مذکور کی طرف اشارہ کر کے کہا) سُنتا ہوں یہ صاحب گوزؔ کرتے ہیں۔ مُشاعرہ میں عجیب قہقہہ اُڑا۔ لکھنؤ میں ہزاروں آدمی مشاعرہ میں جمع ہوتے تھے۔ سب کے کان تک آواز نہ گئی تھی۔ کئی کئی دفعہ کہوا کر سُنا۔ ادھر شخص موصوف اُدھر میر تقی صاحب دونوں چُپ بیٹھے سُنا کئے۔

سوزؔ کی شعر خوانی کا انداز

سوزؔ نے علاوہ شاعری کے شعر خوانی کا ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ کہ جس سے کلام کا لُطف دو چند ہو جاتا تھا۔ شعر کو اس طرح ادا کرتے تھے۔ کہ خود مضمون کی صورت بن جاتے تھے۔ اور لوگ بھی نقل اُتارتے تھے مگر وہ بات کہاں! آواز دردناک تھی۔ شعر نہایت نرمی اور سوز و گداز سے پڑھتے تھے۔ اور اس میں

اعضاء سے بھی مدد لیتے تھے۔ مثلاً شمع کا مضمون باندھتے تھے۔ تو پڑھتے وقت ایک ہاتھ سے شمع اور دوسرے کی اوٹ سے وہیں فانوس تیار کر کے بتاتے۔ بے دماغی یا ناراضی کا مضمون ہوتا تو خود بھی تیوری چڑھا کر وہیں بگڑ جاتے اور تم بھی خیال کر کے دیکھ لو ان کے اشعار اپنے پڑھنے کے لئے ضرور حرکات و انداز کے طالب ہیں۔ چنانچہ یہ قطعہ بھی ایک خاص موقع پر ہُوا تھا۔ اور عجیب انداز سے پڑھا گیا ؎

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے
سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفلِ پری رو۔
ارے رے رے رے۔ ارے رے رے رے۔ ارے رے رے

چوتھا مصرع پڑھتے پڑھتے وہیں زمیں پر گر پڑے۔ گویا پریزادوں کو دیکھتے ہی دل بے قابو ہو گیا۔ اور ایسے نڈھال ہوئے کہ ارے ارے ارے کہتے کہتے غش کھا کر بے ہوش ہو گئے۔ ایک غزل میں قطعہ اس انداز سے سُنایا تھا۔ کہ سارے مشاعرہ کے لوگ گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے

تھے سے

او یار سیاہ زلف سچ کہہ
بتلا دے دِل جہاں چھُپا ہو
کنڈلی تلے دیکھ تو نہ ہووے
کاٹا نہ ہفی ؟ ترا بُرا ہو

پہلے مصرع پر ڈرتے ڈرتے۔ بچکہ جھُکے۔ گویا کنڈلی تلے دیکھنے کو جھکے ہیں۔ اور جس وقت کہا۔ کاٹا نہ ہفی۔ بس دفعتہً ہاتھ کو چھاتی تلے مسوس کر ایسے بے اختیار لوٹ گئے کہ لوگ گھبرا کر سنبھالنے کو کھڑے ہوگئے۔ (صبح افعی ہے محاورہ میں ہفی کہتے ہیں)

میر تقی میر

دِلّی میں شاہ عالم کا دربار اور امرا و شرفا کی محفلوں میں ادب ہر وقت میر کے لئے جگہ خالی کرتا تھا۔ اور اُن کے جوہر کمال اور نیکی اطوار و اعمال کے سبب سے سب

عظمت کرتے تھے۔ مگر خالی آدابوں سے خانداں تو نہیں
پل سکتے۔ اور وہاں تو خود خزانۂ سلطنت خالی پڑا تھا۔ اس
لئے سنہ ۱۱۹۰ھ میں دلّی چھوڑنی پڑی۔
جب لکھنؤ چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا
ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے اور دلّی کو خدا
حافظ کہا۔ تھوڑی دُور آگے چل کر اس شخص نے کچھ بات
کی میر صاحب چین بجبیں ہو کر بولے کہ صاحب قبلہ
آپ نے کرایہ دیا ہے۔ بیشک گاڑی میں بیٹھئے۔ مگر باتوں
سے کیا تعلق؟ اس نے کہا۔ حضرت کیا مضائقہ ہے۔ راہ
کا شغل ہے۔ باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے۔ میر صاحب
بگڑ کر بولے کہ خیر آپ کا شغل ہے۔ میری زبان خراب
ہوتی ہے۔

میر اور لکھنؤ کا مشاعرہ

لکھنؤ میں پہنچ کر جیسا مسافروں کا دستور ہے۔ ایک
سرا میں اترے۔ معلوم ہوا کہ یہاں آج ایک جگہ مشاعرہ

ہے۔ رہ نہ سکے۔ اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرہ میں
جاکر شامل ہوئے۔ ان کی وضع قدیمانہ۔ کھڑکی دار پگڑی
پچاس گز کے گھیر کا جامہ۔ ایک پورا تھان پستولئے کا کمر
سے بندھا۔ ایک رومال پٹڑی دار تہ کیا ہوا۔ اُس میں
آویزاں۔ مشروع کا پاجامہ۔ جس کے عرض کے پائنچے
ناگ پھنی کی انی دار جوتی۔ جس کی ڈیڑھ بالشت اُونچی
نوک۔ کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار دوسری
طرف کٹار۔ ہاتھ میں جریب۔ غرض جب داخل محفل ہوئے
تو وہ شہر لکھنؤ نئے انداز۔ نئی تراشیں۔ بانکے ٹیڑھے
جوان جمع۔ انہیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ میر صاحب
بیچارے غریب الوطن زمانہ کے ہاتھ سے پہلے ہی دل شکستہ
تھے۔ اور بھی دل تنگ ہوئے۔ اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع
اُن کے سامنے آئی تو پھر سب کی نظر پڑی۔ اور بعض
اشخاص نے پوچھا کہ وطن کہاں ہے؟ میر صاحب نے
یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل طرحی میں داخل کیا ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا۔ بہت معذرت کی۔ اور میر صاحب سے عفو تقصیر چاہی۔ کمال کے طالب تھے۔ صبح ہوتے ہوتے شہر میں مشہور ہو گیا۔ کہ میر صاحب تشریف لائے۔ رفتہ رفتہ نواب آصف الدولہ مرحوم نے سُنا اور دو سو روپیہ مہینہ کر دیا ؂

نواب آصف الدولہ کی فرمایش

ایک دن نواب آصف الدولہ مرحوم نے غزل کی فرمائش کی۔ دوسرے تیسرے دن جو پھر گئے۔ تو پوچھا کہ میر صاحب! ہماری غزل لائے ؟ میر صاحب

نے تیوری بدل کر کہا۔ جناب عالی! مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ہی نہیں کہ کل آپ نے فرمایش کی آج غزل حاضر کر دے۔ اُس فرشتہ خصال نے کہا۔ خیر میر صاحب جب طبیعت حاضر ہو گی کہہ دیجیے گا۔

میر صاحب کی نازک مزاجی

ایک دن نواب آصف الدولہ نے بُلا بھیجا۔ جب پہنچے تو دیکھا کہ نواب حوض کے کنارے کھڑے ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی ہے۔ پانی میں لال سبز مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں آپ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میر صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میر صاحب کچھ فرمایئے۔ میر صاحب نے غزل سُنانی شروع کی۔ نواب صاحب سُنتے جاتے تھے۔ اور چھڑی کے ساتھ مچھلیوں سے بھی کھیلتے جاتے تھے۔ میر صاحب چیں بجبیں ہوتے اور ہر شعر پہ ٹھیر جاتے تھے۔ نواب صاحب کہے جاتے تھے کہ ہاں پڑھیے

آخر چار شعر پڑھ کر میرؔ صاحب ٹھہر گئے۔ اور بولے کہ
پڑھوں کیا۔ آپ تو پھلیوں سے کھیلتے ہیں۔ متوجہ ہوں
تو پڑھوں۔ نواب نے کہا جو شعر ہوگا۔ آپ متوجہ کر لیگا
میرؔ صاحب کو یہ بات زیادہ تر ناگوار گزری غزل جیب
میں ڈال کر گھر کو چلے آئے۔ اور پھر جانا چھوڑ دیا۔ چند
روز کے بعد ایک دن بازار میں چلے جاتے تھے۔ نواب
کی سواری سامنے سے آگئی۔ دیکھتے ہی نہایت محبت
سے بولے کہ میرؔ صاحب آپ نے بالکل ہمیں چھوڑ دیا
کبھی تشریف بھی نہیں لاتے۔ میرؔ صاحب نے کہا بازار
میں باتیں کرنا آداب شرفا نہیں۔ یہ کیا گفتگو کا موقع
ہے؟ غرض بدستور اپنے گھر میں بیٹھے رہے۔ اور فقر و
فاقہ میں گزارتے رہے ؂

سعادت یار خاں رنگین۔ نواب طہماسپ بیگ خاں

قلعدار شاہی کے بیٹے تھے - ۱۴-۱۵- برس کی عمر تھی- بڑی شان و شوکت سے گئے- اور غزل اصلاح کے لئے میرؔ کی خدمت میں پیش کی- سُن کر کہا کہ صاحبزادے! آپ خود امیر ہیں اور امیر زادے ہیں- نیزہ بازی- تیر اندازی کی کثرت کیجئے- شہسواری کی مشق فرمائیے- شاعری دلخراشی و جگر سوزی کا کام ہے- آپ اس کے درپے نہ ہوں جب انہوں نے بہت اصرار کیا تو فرمایا کہ آپ کی طبیعت اِس فن کے مناسب نہیں- یہ آپ کو نہیں آنے کا- خواہ مخواہ میری اور اپنی اوقات ضایع کرنی کیا ضرور ہے- یہی معاملہ شیخ ناسخؔ کے ساتھ گزرا ؛

میرؔ سے لکھنؤ میں کسی نے پُوچھا- کیوں حضرت آجکل شاعر کون کون ہے؟ کہا ایک تو سوداؔ- دوسرا خاکسار ہے اور کچھ تامُّل کرکے کہا آدھے خواجہ میر دردؔ - کوئی

شخص بولا کہ حضرت! اور میر سوز صاحب ؟ چین بجبیں ہو کر کہا کہ میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں ؟ انہوں نے کہا کہ آخر اُستاد نواب آصف الدولہ کے ہیں۔ کہا کہ خیر یہ ہے تو پونے تین سہی۔ مگر شرفا ہیں، ایسے تخلّص ہم نے کبھی نہیں سُنے۔ میر صاحب کے سامنے مجال کس کی تھی جو کہے کہ۔ان بیچارے نے میر تخلّص کیا تھا۔ وہ آپ نے چھین لیا۔ ناچار اب اُنہوں نے ایسا تخلّص اختیار کیا کہ نہ آپ کو پسند آئے نہ آپ اسے چھینیں ؛

میر صاحب کی نازک مزاجی

لکھنؤ کے چند عمائد وارا کین جمع ہو کر ایک دن آئے کہ میر صاحب سے ملاقات کریں اور اشعار سُنیں۔ دروازہ پر آکر آواز دی۔ لونڈی یا ماما نکلی۔ حال پُوچھ کر اندر گئی۔ ایک بوریا لاکر ڈیوڑھی میں بچھایا۔ اُنہیں بٹھایا۔ اور ایک پرانا سا حُقّہ تازہ کر کے سامنے رکھ گئی۔ میر صاحب اندر

سے تشریف لائے - مزاج پرسی وغیرہ کے بعد انہوں نے فرمائش اشعار کی - میر صاحب نے اوّل کچھ ٹالا - پھر صاف جواب دیا کہ صاحب قبلہ - میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے - اگرچہ ناگوار ہوُا - مگر بنظر آداب و اخلاق انہوں نے اپنی نارسائی طبع کا اقرار کیا - اور پھر درخواست کی - انہوں نے پھر انکار کیا - آخر ان لوگوں نے گراں خاطر ہو کر کہا کہ حضرت انوری و خاقانی کا کلام سمجھتے ہیں - آپ کا ارشاد کیوں نہ سمجھیں گے - میر صاحب نے کہا کہ یہ درست ہے - مگر ان کی شرحیں مصطلحات اور فرہنگیں موجود ہیں - اور میرے کلام کے لئے نقط محاورۂ اہل اردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں اور اس سے آپ محروم ہیں - یہ کہہ کر ایک شعر پڑھا ؎

عشق بُرے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا
دِل کا جانا ٹھیر گیا ہے صُبح گیا یا شام گیا

اور کہا آپ بموجب اپنی کتابوں کے کہینگے کہ خیال کی ی کو ظاہر کرو - پھر کہینگے کہ ی تقطیع میں گرتی ہے - مگر یہاں اسکے سوا جواب نہیں کہ محاورہ یہی ہے ؁

شاہانہ نوازشیں

جب نواب آصف الدولہ مر گئے۔ سعادت علی خاں کا دَور ہوا۔ تو میر دربار جانا چھوڑ چکے تھے۔ وہاں کسی نے طلب نہ کیا۔ ایک دن نواب کی سواری جاتی تھی۔ یہ مسجد پہ سرِراہ بیٹھے رہے۔ سیّد انشاء خواصی میں تھے۔ نواب نے پوچھا کہ انشا یہ کون شخص ہے؟ جس کی تمکنت نے اُسے اُٹھنے بھی نہ دیا۔ عرض کی جنابِ عالی یہ وہی گدائے متکبّر ہے۔ جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے۔ گزارے کا وہ حال اور مزاج کا یہ عالم۔ آج بھی فاقہ ہی سے ہوگا۔ سعادت علیخاں نے آکر خلعت بحالی اور ایک ہزار روپیہ دعوت کا بھجوایا۔ جب چوبدار لے کر گیا۔ میر صاحب نے واپس کر دیا اور کہا مسجد میں بھجوا دیجئے۔ یہ گنہگار اِتنا محتاج نہیں۔ سعادت علی خاں جواب سُن کر متعجب ہوئے۔ مصاحبوں نے پھر سمجھایا۔ غرض نواب کے حکم سے سیّد انشاء خلعت لیکر گئے اور اپنی طرز پر سمجھایا کہ نہ اپنے حال پہ! بلکہ عیال پہ رحم کیجئے۔ اور

بادشاہ وقت کا ہدیہ ہے۔ اسے قبول فرمائیے۔ میر صاحب نے کہا کہ صاحب! وہ اپنے ملک کے بادشاہ ہیں۔ میں اپنے ملک کا بادشاہ ہوں۔ کوئی ناواقف اِس طرح پیش آتا تو مجھے شکایت نہ تھی۔ وہ مجھ سے واقف میرے حال سے واقف۔ اِس پر اتنے دنوں کے بعد۔ ایک دس روپیہ کے خدمتگار کے ہاتھ خلعت بھیجا۔ مجھے اپنا فقر و فاقہ قبول ہے۔ مگر یہ ذلت نہیں اُٹھائی جاتی۔ سیّد انشاء کی لسانی اور لفّاظی کے سامنے کس بات کی پیش جا سکتی۔ میر صاحب نے قبول فرمایا۔ اور دربار میں بھی کبھی کبھی جانے لگے۔ نواب سعادت علی خاں مرحوم اُن کی ایسی خاطر کرتے تھے کہ اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دیتے تھے اور اپنا بیچواں پینے کو عنایت کرتے تھے ؎

میر صاحب کا عالم محویت

میر صاحب کو بہت تکلیف میں دیکھ کر لکھنؤ کے ایک رئیس انہیں مع عیال اپنے گھر لے گئے اور محل سرا

کے پاس ایک معقول مکان رہنے کو دیا کہ نشست کے مکان میں کھڑکیاں باغ کی طرف تھیں۔ مطلب اس سے یہی تھا کہ ہر طرح اُن کی طبیعت خوش اور شگفتہ رہے۔ یہ جس دن وہاں آکر رہے کھڑکیاں بند پڑی تھیں۔ کئی برس گزر گئے۔ اسی طرح بند پڑی رہیں۔ کبھی کھول کر باغ کی طرف نہ دیکھا۔ ایک دن کوئی دوست آئے۔ انہوں نے کہا کہ ادھر باغ ہے آپ کھڑکیاں کھول کر کیوں نہیں بیٹھتے۔ میرؔ صاحب بولے کیا ادھر باغ بھی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ اسی لئے نواب آپ کو یہاں لائے ہیں۔ کہ جی بہلتا رہے اور دل شگفتہ ہو۔ میرؔ صاحب کے پھٹے پُرانے مسودے غزلوں کے پڑے تھے۔ اُن کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں تو اس باغ کی فکر میں ایسا لگا ہوں کہ اُس باغ کی خبر بھی نہیں۔ یہ کہہ کر چپکے ہو رہے۔

کیا محویت ہے! کئی برس گزر جائیں۔ پہلو میں باغ ہو اور کھڑکی تک نہ کھولیں۔ خیر۔ ثمرہ اس کا یہ ہوا کہ اُنہوں نے دُنیا کے باغ کی طرف نہ دیکھا۔ خدا نے اُن کے کلام کو وہ بہار دی کہ سالہا سال گزر گئے۔ آج تک لوگ ورقے

اُلٹتے ہیں۔ اور گلزار سے زیادہ خوش ہوتے ہیں ٭

میر صاحب کی قناعت

گورنر جنرل اور اکثر صاحبان عالیشان جب لکھنؤ میں جاتے تو اپنی قدردانی سے یا اس سبب سے کہ انکے میر منشی اپنے علّو حوصلہ سے ایک صاحب کمال کی تقریب واجب سمجھتے تھے۔ میر صاحب کو ملاقات کے لئے بُلاتے۔ مگر یہ پہلو تہی کرتے۔ اور کہتے کہ مجھ سے جو کوئی ملنا ہے یا تو مجھ فقیر کے خاندان کے خیال سے یا میرے کلام کے سبب سے ملتا ہے۔ صاحب کو خاندان سے غرض نہیں۔ میرا کلام سمجھتے نہیں۔ البتہ کچھ انعام دینگے۔ ایسی مُلاقات سے ذِلّت کے سوا کیا حاصل ٭

جرأت کی آنکھیں

بزرگوں کا قول ہے کہ شرافت و نجابت غریبی پر عاشق ہے۔ دولت اور نجابت آپس میں سوکن ہے۔ یہ حق ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ شرافت کے اصول و آئین غریبوں ہی سے خوب نبھتے ہیں۔ امارت آئی قیامت آئی۔ دولت آئی شامت آئی۔ میاں جرأت کی خوش مزاجی، لطیفہ گوئی مسخراپن کی حد سے گذری ہوئی تھی۔ اور ہندوستان کے امیروں کو نہ اس سے ضروری کام۔ نہ اس سے زیادہ کوئی نعمت ہے۔ کہتے ہیں مرزا قتیل۔ سید انشاء اور اُن کا یہ حال تھا۔ کہ گھر میں رہنے نہ پاتے تھے۔ آج ایک امیر کے ہاں۔ دوسرے دن دوسرے امیر آئے۔ سوار کیا اور ساتھ لے گئے۔ ۴۔ ۵ دن وہاں رہے کوئی نواب اور آئے۔ وہاں سے وہ لے گئے۔ جہاں جائیں۔ آرام و آسائش سے زیادہ عیش کا سامان موجود۔ رات دن قہقہے اور چہچے۔ ایک بیگم صاحب نے ان کے چٹکلے اور نقلیں سُنیں۔ بہت خوش ہوئیں

اور نواب صاحب سے کہا کہ ہم بھی باتیں سُنینگے۔ گھر میں لاکر
کھانا کھلاؤ۔ پردے یا چلمنیں چھٹ گئیں۔ اندر وہ بیٹھیں
باہر یہ بیٹھے۔ چند روز کے بعد خاص خاص بیبیوں کا برائے
نام پردہ رہا۔ باقی گھر والے سامنے پھرنے لگے۔ رفتہ رفتہ
یگانگی کی یہ نوبت ہوئی کہ آپ بھی باتیں کرنے لگیں۔ گھر میں
کوئی دادا۔ نانا کوئی ماموں چچا کہتا ہے۔ شیخ صاحب کی
آنکھیں دُکھنے آئیں۔ چند روز ضعف بصر کا بہانہ کر کے
ظاہر کیا۔ کہ آنکھیں معذور ہوگئیں۔ مطلب یہ تھا۔ کہ
اہلِ حُسن کے دیدار سے آنکھیں سُکھ پائیں۔ چنانچہ بے تکلف
گھروں میں جانے لگے۔ اب پردہ کی ضرورت کیا۔ یہ بھی
قاعدہ ہے کہ میاں بیوی جس مہمان کی بہت خاطر کرتے ہیں
نوکر اس سے جلنے لگتے ہیں۔ ایک دن دوپہر کو سو کر
اُٹھے۔ شیخ صاحب نے لونڈی سے کہا کہ بڑے آفتابے
میں پانی بھرلا۔ لونڈی نہ بولی۔ اُنہوں نے پھر پکارا۔ اُس
نے کہا کہ بیوی جائے ضرور میں لے گئی ہیں۔ اُن کے مُنہ
سے نکل گیا۔ کہ غیبانی دوانی ہوئی ہے۔ سامنے تو رکھا ہے
دیتی کیوں نہیں ؟ بیوی دوسرے دالان میں تھیں۔ لونڈی

گئی اور کہا کہ دو تی بیوی یہ مُوا کہتا ہے کہ وہ بندا اندھا ہے۔ یہ تو خاصہ سُجھتّا ہے۔ ابھی میرے ساتھ یہ واردات گزُری۔ اس وقت یہ راز کھُلا۔ مگر اس میں شُبہ نہیں۔ کہ آخر آنکھیں کھو بیٹھے ؎

مزن فال بد کآورد حال بد
مبادا کسے کو زند فال بد

میر صاحب اور جرُأت

مرزا محمد تقی خاں ترقی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ اور تمام امرائے نامی وشعرائے گرامی جمع ہوتے تھے۔ میر تقی مرحوم بھی آتے تھے۔ ایک دفعہ جرُأت نے غزل پڑھی۔ اور غزل بھی وہ ہوئی کہ تعریفوں کے غُل سے شعر تک سُنائی نہ دیتے۔ میاں جرُأت یا تو جوش سرور میں جو کہ اس حالت میں انسان کو سرشار کر دیتا ہے۔ یا شوخی مزاج سے میر صاحب کے چھیڑنے کے ارادہ سے ایک

شاگرد کا ہاتھ پکڑ کے اُن کے پاس آکر بیٹھے اور کہا کہ حضرت!
اگرچہ آپ کے سامنے غزل پڑھنی بے ادبی اور بے حیائی ہے
مگر خیر اس بیہودہ گو نے جو یاوہ گوئی کی آپ نے سماعت
فرمائی۔ میر صاحب تیوری چڑھا کر چپکے ہو رہے۔ جُرأت
نے پھر کہا۔ میر صاحب کچھ ہُوں ہاں کر کے پھر ٹال گئے۔
جب اُنہوں نے بہ تکرار کہا تو میر صاحب نے جو الفاظ
فرمائے۔ وہ یہ ہیں "کیفیت اس کی یہ ہے۔ کہ تم شعر تو
کہہ نہیں جانتے ہو اپنی چُوما چاٹی کہہ لیا کرو"

کریلا بھانڈ

کریلا ایک پرانا بھانڈ دِلی کا رہنے والا۔ نواب شجاع الدولہ
کے ساتھ گیا تھا۔ اور اپنے فن میں صاحب کمال تھا۔
ایک دن کسی محفل میں اس کا طائفہ حاضر تھا۔ شیخ جُرأت
بھی وہاں موجود تھے۔ اُس نے نقل کی۔ ایک ہاتھ میں
لکڑی لے کر دوسرا ہاتھ اندھوں کی طرح بڑھایا۔ ٹٹول
ٹٹول کر پھرنے لگا۔ اور کہنے لگا کہ حضور شاعر بھی اندھا

شعر بھی اندھا مضمون بھی اندھا ؎

صنم سُنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے
کہاں ہے کس طرف کو ہے کِدھر ہے

شیخ صاحب بہت خفا ہوئے۔ گھر آکر اُنہوں نے بھی اس کی ہجو کہہ دی۔ اور خاک خوب اُڑائی اُسے سُن کر کریلا[1] بہت کڑوایا۔ چنانچہ دُوسرے جلسے میں پھر اندھے کی نقل کی اسی طرح لاٹھی لیکر پھرنے لگا۔ ان کی ایک غزل ہے ؎

امشب تیری زُلفوں کی حکایات ہے واللہ
کیا رات ہے کیا رات ہے کیا رات ہے واللہ

ہر رات کے لفظ پر لکڑی کا سہارا بدلتا تھا۔ کیا رات

---

[1] عہد محمد شاہی اور اس سے پیش بیش کا زمانہ خوشحالی کے لحاظ سے بہشتی زمانہ تھا۔ دربار سے جو امیر کسی طرف جاتا تھا وہ ضروری چیزیں اور کاروبار کے آدمی دِلّی سے اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ تاکہ ہر کام ہر رسم ہر بات اور کارخانے کا محاورہ وہی ہو جو دارالخلافہ کا ہے نواب سراج الدولہ مرشد آباد کے صوبہ دار ہو کر گئے تو علاوہ منصبداروں اور ملازموں کے کئی بھانڈ۔ دو تین گویّے۔ دو تین رنڈیاں ایک دو بھگتیے۔ دو تین نانبائی۔ ایک دو کنجڑے اور بھڑ بھونجے تک بھی ساتھ لے گئے۔ اور وہ ایسا وقت تھا۔ کہ دِلّی کا بھڑ بھونجا بھی دس بارہ روپیہ مہینے بغیر دِلّی سے نہ نکلتا تھا ؂

ہے کیا رات ہے، کیا رات ہے واللہ- اس غزل کے ہر شعر کا دوسرا مصرع ایک ہی ڈھنگ پر ہے- چنانچہ ساری غزل کو اسی طرح محفل میں پڑھنا پھرا- شیخ صاحب اور بھی غصہ ہوئے اور پھر آ کر ایک ہجو کہی- ترجیع بند تھا ؎

اکلا جھُولے دُکلا جھُولے ساون ماس کریلا پھُولے

اس کو خبر ہوئی- بہت بھُنا- پھر کسی محفل میں ایک ڈچہ کا سوانگ بھرا اور ظاہر کیا کہ اس کے پیٹ میں بھُتنا گھُس گیا ہے- خود ملاّ بن کر بیٹھا اور جس طرح جنّات اور سیانوں میں لڑائی ہوتی ہے- اسی طرح جھگڑتے جھگڑتے بولا کہ ارے نامراد کیوں غریب ماں کی جان کا لاگو ہوا ہے- جرأت ہے تو باہر نکل آ کہ ابھی جلا کر خاک کردوں- آخر اب کی دفعہ اُنہوں نے ایسی خبر لی کہ کربلا خدمت میں حاضر ہوا خطا معاف کروائی اور کہا- کہ میں اگر آسمان کے تارے توڑ لاؤنگا تو بھی اس کا چرچا وہیں تک رہیگا- جہاں تک دائرہ محفل ہے- آپ کا کلام مُنہ سے نکلتے ہی عالم میں مشہور ہو جائے گا- اور پتھر کی لکیر ہو گا- کہ قیامت تک نہ مٹے گا- بس اب میری خطا معاف فرمایئے ؞

اندھے کو اندھیرے میں بہت دُور کی سُوجھی

ایک دن میر انشاء اللہ خاں۔ جُرأت کی ملاقات کو آئے۔ دیکھا تو سر جُھکائے بیٹھے کچھ سوچ رہے ہیں۔ اُنہوں نے پُوچھا کہ کِس فکر میں بیٹھے ہو۔ جرأت نے کہا کہ ایک مصرع خیال میں آیا ہے۔ چاہتا ہوں کہ مطلع ہو جائے۔ اُنہوں نے پُوچھا کہ کیا ہے؟ جرأت نے کہا کہ خوب مصرع ہے۔ مگر جب تک دوسرا مصرع نہ ہو گا۔ تب تک نہ سُناؤں گا۔ نہیں تو تم مصرع لگا کر اُسے بھی چھین لو گے۔ سیّد انشاء نے بہت اصرار کیا۔ آخر جُرأت نے پڑھ دیا ؏

اُس زُلف پہ پھبتی شبِ دیجُور کی سُوجھی

سیّد انشاء نے فوراً کہا کہ ؏

اندھے کو اندھیرے میں بہت دُور کی سُوجھی

جُرأت ہنس پڑے اور اپنی لکڑی اُٹھا کر مارنے کو دوڑے۔

دیر تک سیّد انشاؔ آگے آگے بھاگتے پھرے اور یہ پیچھے پیچھے لٹھ لیئے پھرے۔ اللہ اکبر! کیا شگفتہ مزاج لوگ تھے۔ کیا خوش دلی اور فارغ البالی کے زمانے تھے۔

سیّد انشاءؔ نے اِن کے نام کا معمّہ کہا تھا۔ سر منڈی نگوڑی گجراتن۔ لطیفہ اس میں یہ تھا کہ گجراتن اِن کی ماں کا نام تھا۔

شاہ عالم اور سیّد انشاؔ کے ناز

دلّی میں اگرچہ بادشاہ اسوقت فقط بادشاہ شطرنج تھا یہاں تک کہ مال و دولت کے ساتھ غلام قادر نقد بصارت تک بھی لے گیا تھا۔ مگر یہ اپنا مطلب ہزار طرح سے نکال لیتے تھے۔ مثلاً جمعرات کا دن ہوتا۔ تو باتیں کرتے کرتے دفعتہً خاموش ہوتے اور کہتے کہ پیر و مرشد غلام کو اجازت ہے؟ بادشاہ کہتے خیر باشد۔ کہاں؟ کہاں؟ یہ کہتے حضور آج جمعرات ہے۔ غلام نبی کریم جائے۔ شاہ دین و دُنیا کا دربار ہے کچھ عرض کرے، شاہ عالم بہ ادب کہتے کہ ہاں بھئی

ضرور چاہیئے۔ سیّد انشاؔ اللہ خاں ہمارے لئے بھی کچھ عرض کرنا۔ یہ عرض کرتے کہ حضور! غلام کی اور آرزو کون سی ہے۔ یہ کہہ کر پھر خاموش ہوتے۔ بادشاہ کچھ اور بات کرنے لگتے۔ ایک لمحہ کے بعد پھر یہ کہتے کہ پیرو مرشد! پھر غلام کو اجازت ہو۔ بادشاہ کہتے کہ ہیں اسے بھئی میر انشاءؔ اللہ خاں ابھی تم گئے نہیں؟ یہ کہتے حضور بادشاہ عالیجاہ کے دربار میں غلام خالی ہاتھ کیونکر جائے۔ کچھ نذرونیاز کچھ چراغی کو تو مرحمت ہو! بادشاہ کہتے ہاں بھئی درست درست! مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔ جیب میں ہاتھ ڈالتے اور کچھ روپے نکال کر دیتے۔ میر انشاءؔ اللہ خاں لیتے اور ایک دو فقرہ دعائیہ کہہ کر پھر کہتے کہ حضور دوسری جیب میں دست مبارک جائے تو فادوی کا کام چلے۔ کیونکہ وہاں سے پھر کر بھی تو آنا ہے۔ بادشاہ کہتے کہ ہیں! ہاں بھئی سچ ہے۔ سچ ہے۔ بھلا وہاں سے دو دو کھجوریں تو کسی کو لاکر دو۔ بال بچے کیا جانیں گے۔ کہ تم آج کہاں گئے تھے۔ اگرچہ اِن فقروں سے یہ کام نکال لیتے تھے۔ لیکن پھر کب تک؟ آخر دِلّی سے دِل اُچاٹ ہوا۔ اور لکھنؤ کا رُخ کیا

انوکھی فرمائشیں

سعادت علی خاں نواڑے میں لیٹے ہوئے میر انشاؔ اللہ خاں کی گود میں سر دھرا ہوا سُرور کے عالم میں دریا کی سیر کرتے چلے جاتے تھے۔ لب دریا ایک حویلی پہ لکھا دیکھا حویلی علی نقی بہادر کی۔ کہا کہ انشاء دیکھیو کسی نے تاریخ کہی۔ مگر نظم نہ کر سکا۔ بھئی تم لے دیکھا بہت خوب مادّہ ہے اسے رباعی کر دو۔ اُسی وقت عرض کی۔

نہ عربی نہ فارسی نہ تُرکی! نہ سَم کی نہ تال کی نہ سُر کی
یہ تاریخ کہی ہے کسی اُلّو کی حویلی علی نقی خاں بہادر کی

میاں بیتاب کا قول لکھ رکھنے کے قابل ہے کہ سید انشاء کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے ڈبویا۔

لطیفۂ رنگیں

انشاء ایک دن نواب صاحب کیساتھ بیٹھے کھانا کھا

رہے تھے۔ اور گرمی سے گھبرا کر دستار سر سے رکھ دی تھی۔
منڈا ہوا سر دیکھ کر نواب کی طبیعت میں چہل آئی۔ ہاتھ
بڑھا کر پیچھے سے ایک دھول ماری۔ آپ نے جلدی سے
ٹوپی سر پر رکھ لی اور کہا۔ سبحان اللہ بچپن میں بزرگ
سمجھایا کرتے تھے۔ وہ بات سچ ہے کہ ننگے سر کھانا کھاتے
ہیں تو شیطان دھولیں مارا کرتا ہے۔

ایک باہرے کے حریف سے لطیفہ

رات بہت گئی تھی اور انشاء کے لطائف و ظرائف
کی آتشبازی چھوٹ رہی تھی۔ یہ رخصت چاہتے تھے۔ اور
موقع نہ پاتے تھے۔ نواب کے ایک مصاحب باہرے
کے رہنے والے اکثر اہل شہر کی باتوں پر طعن کیا کرتے
تھے۔ اور نواب صاحب سے کہا کرتے تھے کہ آپ خواہ
مخواہ سید انشاء کے کمال کو بڑھاتے چڑھاتے ہیں حقیقت

ہیں وہ اِتنے نہیں۔ اُس وقت اُنہوں نے بقاؔ کا یہ مطلع نہایت تعریف کے ساتھ پڑھا ؎

دیکھ آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں
اس کا میں دیکھنے والا ہوں بقاؔ واہ رے

سب نے تعریف کی۔ نواب نے بھی پسند فرمایا۔ اُنہوں نے کہا کہ حضور سید انشاءؔ سے اس مطلع کو کہوائیں۔ نواب نے ان کی طرف دیکھا۔ مطلع حقیقت میں لاجواب تھا۔ اُنہوں نے بھی ذہن لڑایا۔ فکر نے کام نہ کیا۔ اُنہوں نے پھر تقاضا کیا۔ سید موصوف نے فوراً عرض کی کہ جنابِ عالی مطلع تو نہیں ہوا مگر شعر حسبِ حال ہو گیا ہے۔ حکم ہو تو عرض کروں ؎

ایک لکی کھڑا دروازہ پہ کہتا تھا رات
آپ تو بہنیرے جا پاڑہ رہے باہرے میں

اِنشاءؔ کی نواب سے مطلب برآری

ایک دن نواب نے روزہ رکھا اور حکم دیا کہ کوئی

آنے نہ پائے۔ سید انشاء کو ضروری کام تھا۔ یہ پہنچے پہرہ دار نے کہا کہ آج حکم نہیں۔ آگے آپ مالک ہیں۔ باوجود انتہائے مرحمت کے یہ بھی مزاج سے ہشیار رہتے تھے۔ تھوڑی دیر تامل کیا۔ آخر کمر کھول دستار سر سے بڑھا تیا اُتار ڈالی۔ اور ڈوپٹہ عورتوں کی طرح سے اوڑھ کر ایک ناز و انداز کے ساتھ سامنے جا کھڑے ہوئے۔ جونہی اُسکی نظر پڑی۔ آپ انگلی ناک پر دھر کر بولے ؎

بس تیرے صدقہ نہ رکھ اے مری پیاری روزہ
بندی رکھ لیگی ترے بدلے ہزاری روزہ۔

نواب بے اختیار ہنس پڑے۔ جو کچھ کہنا سُننا تھا۔ وہ کہا اور ہنستے کھیلتے چلے آئے۔

انشا کی ہمدردی

ان کے حالات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے عامہ خلایق خصوصاً اہل دہلی کی رفاقت اور رواج کار

کا بیڑا اُٹھایا ہوا تھا۔ چنانچہ لکھنؤ میں میر علی صاحب ایک مرثیہ خواں تھے کہ علم موسیقی میں انہوں نے حکماء کا مرتبہ حاصل کیا تھا۔ مگر اپنے گھر ہی میں مجلس کرکے پڑھتے تھے۔ کہیں جاکر نہ پڑھتے تھے۔

نواب نے ان کے شہرۂ کمال سے مشتاق ہوکر طلب کیا انہوں نے انکار کیا اور کئی پیغام سلام کے بعد یہ بھی کہا کہ اگر وہ حاکم وقت ہیں تو میں بھی سیادت کے اعتبار سے شاہزادہ ہوں۔ اُنہیں میرے ہاں آنے سے عار کیا ہے؟

نواب نے کہا کہ سیّد میرے ہاں ہزاروں سے زیادہ ہیں میر صاحب نے اگر فخر پیدا کیا تو یہی کیا کہ سیّد تھے اب ڈوم بھی ہوگئے۔ خیر انہیں اختیار ہے۔ میر علی صاحب نے یہ سُن کر خیالات چند در چند سے فوراً دکن کا ارادہ کیا۔ سیّد انشاء جو شام کو گھر آئے تو دیکھا کہ کچھ سامانِ سفر ہو رہا ہے۔ سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ میر علی صاحب لکھنؤ سے جاتے ہیں۔ چونکہ آپ کے بھتیجے بھانجے بھی اُن کے شاگرد ہیں۔ وہ بھی اُستاد کی رفاقت کرتے ہیں۔ میر علی صاحب کے جانے کا سبب پوچھا تو یہ معاملہ معلوم ہوا۔

اسی وقت کمر باندھ کر پہنچے۔ سعادت علی خاں نے متحیر ہو کر پوچھا کہ خیر باشد! پھر کیوں آئے؟ اُنہوں نے غزل پڑھی۔ جس کا شعر یہ ہے ؎

دولت بنی ہے اور سعادت علی بنا
یارب بنا بنی میں ہمیشہ بنی رہے

پھر کہا کہ حضور! غلام جو اس وقت رخصت ہو کر چلا تو دل نے کہا کہ اپنے دولہا کی دُلھن/عروس سلطنت کو کو ذرا دیکھوں! حضور! واقعی کہ بارہ ابھرن سولہ سنگار سے سجی تھی۔ سر پہ جھومر۔ وہ کون؟ مولوی دلدار علی صاحب کانوں میں جھمکے۔ وہ کون؟ دونوں صاحبزادے گلے میں نولکھا ہار۔ وہ کون؟ خان علامہ۔ غرض اسیطرح چند زیوروں کا نام لے کر کہا کہ حضور غور جو کرتا ہوں تو ناک میں نتھ نہیں۔ دل دھک سے رہ گیا کہ اللہ سہاگ کو قائم رکھے۔ یہ کیا۔ نواب نے پوچھا کہ پھر وہ کون؟ کہا حضور! نتھ میر علی صاحب۔ بعد اس کے کیفیت مفصل بیان کی۔ نواب نے ہنس کر کہا کہ ان کی دُور اندیشیاں بیجا ہیں۔ میں ایسے صاحب کمال کو فخر لکھنؤ سمجھتا ہوں۔

غرض اس شہرت بے اصل کے لئے ترقی کا پروانہ اور ۵۰۰ روپیہ کا خلعت لے کر وہاں سے پھرے ٭

جان بیلی صاحب کی ملاقات

جان بیلی صاحب کہ اُس عہد میں ریزیڈنٹ اودھ تھے۔ اگرچہ سیّد انشاء کا نام اور شہرہ عام سنتے تھے۔ مگر دیکھا نہ تھا۔ جب سیّد انشاء نواب سعادت علی خاں کے پاس ملازم ہوئے تو ایک دن صاحب کے آنے کی خبر ہوئی۔ نواب نے کہا انشاء آج ہم تمہیں بھی صاحب سے ملائیں گے۔ عرض کی کہ حضور کی ہر طرح پرورش ہے۔ مگر فدوی کے باب میں کچھ تقریب ملاقات کی ضرورت نہیں۔ غرض جس وقت صاحب ممدوح آئے۔ نواب اور وہ آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے سیّد انشاء نواب کے پیچھے کھڑے ہو کر رومال ہلاتے تھے۔ باتیں باتیں کرتے کرتے صاحب نے ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ایک چہرہ کی لی۔ اُنہوں نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ مگر

دل میں حیران ہوئے کہ اس آدمی کی صورت کیسی ہے؟ یہ خیال کرتے ہی پھر نظر پڑی۔ اب کی دفعہ انہوں نے ایسا چہرہ بدلا کہ اس سے بھی عجیب۔ وہ شرما کر اور طرف دیکھنے لگے۔ پھر جو دیکھا تو انہوں نے ایسا منہ بنایا کہ اس سے بھی الگ تھا۔ آخر نواب سے پوچھا کہ یہ مصاحب آپ کے پاس کب ملازمت میں آئے۔ میں نے آج ہی انہیں دیکھا ہے۔ نواب نے کہا کہ ہاں آپ نے نہیں دیکھا۔ سیّد انشاء اللہ خاں یہی ہیں۔ جانؔ بیلی صاحب بہت ہنسے۔ ان سے ملاقات کی۔ پھر تو ان کی جادو بیانی نے ایسا تسخیر کیا کہ جب آتے۔ پہلے پوچھتے کہ سیّدؔ انشاء کجا ست؟

میر منشی صاحب کا لطیفہ

جانؔ بیلی صاحب کے ساتھ علیؔ نقی خاں میر منشی رزیڈنٹی بھی آیا کرتے تھے۔ اِن کی اُن کی عجب لطف کی چوٹیں ہوتی تھیں۔ ایک دن اثنائے گفتگو میں کسی کی زبان سے نکلا۔

ع شاید کہ پلنگ خفتہ باشد۔ اُنہوں نے کہا کہ گلستاں
کے ہر شعر میں مختلف رواَیتیں ہیں۔ اور لُطف یہ ہے کہ
کوئی کیفیت سے خالی نہیں۔ چنانچہ ہوسکتا ہے ع
شاید کہ پلنگ خفیہ باشد۔ سعادت علی خاں نے سیّد
انشاؔ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ
حضور! میر منشی صاحب بجا فرماتے ہیں۔ غلام نے بھی
ایک نسخہ گلستاں میں یہی دیکھا تھا ؎

تا مرد سخن نگفیہ باشد — عیب و ہنرش نہفیہ باشد
در بیشہ گماں مبر کہ خالی ست — شاید کہ پلنگ خفیہ باشد

بلکہ وہ نسخہ بہت صحیح اور محشی تھا۔ اُس میں گفیہ
اور نہفیہ کے کچھ معنے بھی لکھے تھے۔ میر منشی صاحب!
آپ کو یاد ہیں؟ وہ نہایت شرمندہ ہوئے۔ جب وہ
رخصت ہوتے۔ تو سیّد انشاء کہا کرتے۔ میر منشی
صاحب کا اللہ بیلی ۔

سیّد انشاء نے پنڈت جی کا رُوپ دھارا

مرزا سلیماںؔ شکوہ کا مکان لبِ دریا تھا۔ معلوم ہُوا کہ کل یہاں ایک اشنان کا میلہ ہے۔ سیّد انشاءؔ نے کہ رنگت کے گورے۔ بدن کے فربہ۔ صورت کے جامہ زیب تھے۔ پنڈتانِ کشمیر کا لباس درست کرکے سب سامان پُوجا پاٹ کا تیار کیا۔ صبح کو سب سے پہلے دریا کے کنارے ایک مہنت دھرم مُورت بن کر جا بیٹھے۔ اور خوب زور شور سے اشلوک پڑھنے اور منتر جپنے شروع کر دیئے۔ لوگ اشنان کے لئے آنے لگے۔ مگر عورت مرد بچہ بوڑھا جو آتا۔ الغرض خواہ مخواہ مرد آدمی دیکھ کر انہیں کی طرف جُھکتا۔ یہ انہیں پُوجا کرواتے تھے۔ تلک لگاتے تھے۔ جن دوستوں سے راز کہہ رکھا تھا۔ اُنہوں نے مرزا سلیماںؔ شکوہ کو خبر دی وہ مع جلسہ اسی وقت لبِ بام

آئے۔ دیکھیں تو فی الحقیقت اناج۔ آٹا۔ پیسے۔ کوڑیوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ وہ بھی اس قدر کہ اور سب سے زیادہ۔ اس میں تفریح طبع یا لیاقت ہر فنی کے اظہار کے ساتھ یہ نکتہ بھی تھا۔ کہ حضور خانہ زاد کو وبال دوش نہ سمجھیں۔ نہ اِس شاعری کا پابند جانیں۔ جس کوچہ میں جا ئیگا۔ اوروں سے کچھ اچھا ہی لے نکلیگا۔

فایق کے ساتھ لطیفہ

فایقؔ تخلّص ایک فلک زدہ شاعر تھا۔ خُدا جانے کس بات پر خفا ہُوا کہ ان کی ہجو کہی اور خود لاکر سُنائی۔ اُنہوں نے بہت تعریف کی۔ بہت کو دے اور پانچ روپے بھی دیئے۔ جب وہ چلا تو بولے ذرا ٹھیریئے گا۔ ابھی آپ کا حق باقی ہے قلم اُٹھا کر یہ قطعہ لکھا اور حوالہ کیا۔

فایق بے حیا چو ہجوم گفت — دل من سوخت ساخت سوختہ
صلہ اش پنج روپیہ دادم — دہن سگ بہ لقمہ دوختہ۔

اللہ حافظ احمدؐ یار

دِلّی میں حافظ احمدؐ یار ایک معقول صحبت یافتہ نامور حافظ تھے۔ اور سرکار شاہی میں حافظانِ قرآن میں نوکر تھے۔ اگرچہ دنیا میں ایسا کون تھا۔ جس سے سیّد انشاؔ یارانہ نہ برتیں۔ مگر حافظ احمدؐ یار کے بڑے یار تھے۔ اُن کا سجع کہا تھا۔ ع اللہ حافظ احمدؐ یار۔ حافظ صاحب ایک دن ملنے گئے رستہ میں مینہ آگیا اور وہاں پہنچنے تک مُوسلا دھار برسنے لگا۔ یہ جا کر بیٹھے ہی تھے جو حرم سرا سے ننگے ننگے ایک کھاروے کی لُنگی باندھے آپ دوڑے آئے اُنہیں دیکھتے ہی اُچھلنے لگے۔ ہاتھ پھیلا پھیلا کر گردپھرتے تھے اور کہے جاتے تھے ؎

بھر بھر چھاجوں برست نورؐ
رو بلّیاں دُسمن دُور

حافظ مذکور جب رُخصت ہوتے تھے تو ہمیشہ کہا کرتے تھے۔ ع اللہ حافظ احمدؐ یار۔ ایسے ایسے

معاملات ہزاروں تھے کہ دن رات بات بات میں
ہوتے رہتے تھے ۔

انشا کی نواب سے بگڑتی ہے

نہایت افسوس کے قابل یہ بات ہے کہ سعادت علیخاں
کے ہاتھوں سیّد انشا کا انجام اچھا نہ ہوا۔ اسکے مختلف
سبب ہیں۔ اول تو یہ کہ اگرچہ اپنی ہمہ رنگ طبیعت کے
زور سے انہوں نے انہیں پر چالیا تھا۔ مگر درحقیقت ان
کے اور اُن کے معاملات کا مصداق ان کا مطلع تھا ؎

رات وہ بولے مجھ سے ہنس کر چاہ میاں کچھ کھیل نہیں
مَیں ہوں ہنسوڑا تو ہے مقطّع میرا تیرا میل نہیں

مثلاً اکثر میلوں تماشوں میں چلنے کے لئے کچھ احباب کا
تقاضا۔ کچھ ان کی طبیعت اصلی کا تقاضا۔ غرض انہیں جانا
ضرور اور یہ سعادت علی خاں کی طبع کے بالکل مخالف۔ اکثر
ایسا ہوا کہ وہ اپنے کاغذات دیکھ رہے ہیں۔ مصاحبوں

کے ساتھ یہ بھی حاضر ہیں۔ اس میں ایک آدھ لطیفہ بھی ہوتا جاتا ہے۔ اُنہوں نے عرض کیا حضور غلام کو اجازت ہے؟ وہ بولے کہ ہوں! کہاں؟ اُنہوں نے کہا کہ حضور آج آٹھوں کا میلہ ہے۔ اُنہوں نے کہا لاحَول و لاَ قوۃ۔ سیّد انشاء بولے کہ مناسب تو یہ تھا کہ حضور بھی تشریف لے چلتے۔ نواب نے کہا انشاء ایسے نار وامقاموں میں جانا تمہیں کس نے بتایا ہے۔ عرض کی حضور وہاں جانا ایک اعتبار سے فرض عین ہے اور ایک نظر سے واجب کفائی ہے۔ ایک لحاظ سے سُنّت ہے۔ پھر سب کی توجیہیں بھی الگ الگ بیان کیں۔ آخر اسی عالم مصروفیت میں سُنتے سُنتے دق ہو کر نواب نے کہا۔ قصّہ مختصر کرو۔ اور جلدی سدھارو۔ اسی وقت مُونچھوں پر تاؤ دیکر بولے۔ کون ہے آج سوا سیّد انشاء کے جو کچھ کہے اُسے عقل سے نقل سے۔ آیت سے اور روایت سے ثابت کر دے۔ ایسی باتیں بعض موقع پر نواب کو موجب تفریح ہوتی تھیں۔ بعض دفعہ بمقتضائے طبیعت اصلی مکدر ہو جاتے تھے۔ خصوصاً جبکہ رخصت کے وقت خرچ مانگتے تھے۔ کیونکہ وہ شاہ عالم نہ تھا سعادت علیخاں

کتفا سہ

گر جاں طلبی مضائقہ نیست
زر می طلبی سخن دریں است

غضب یہ ہوا کہ ایک دن سر دربار بعض شرفائے خاندانی کی شرافت و نجابت کے تذکرے ہو رہے تھے۔ سعادت علی خاں نے کہا کہ کیوں بھئی ہم بھی نجیب الطرفین ہیں؟ اسے اتفاق تقدیر کہو یا زیادہ گوئی کا ثمرہ سمجھو سید انشا بول اٹھے کہ حضور بلکہ انجب۔ سعادت علی خاں حرم کے شکم سے تھے۔ وہ چپ اور تمام دربار دم ہو گیا۔ اگرچہ انہوں نے پھر اور باتیں بنا بنا کر بات کو مٹانا چاہا۔ مگر کمان تقدیر سے تیر نکل چکا تھا۔ وہ کھٹک دل سے نہ نکلی۔ کہ قَدْ کَانَ الجَارِیَۃ اَنجَب۔

اب نواب کے انداز بدلنے لگے اور اس فکر میں رہنے لگے

کہ کوئی بہانہ ان کی سخت گیری کے لئے ہاتھ آئے۔ یہ بھی انواع و اقسام کے چٹکلوں سے اس کے آئینہ عنایت کو چمکاتے۔ مگر دِل کی کدُورت صفائی کی صُورت نہ بننے دیتی تھی۔

ایک دن سیّد انشا نے بہت ہی گرم لطیفہ سُنایا سعادت علی خاں نے کہا کہ انشاء! جب کہتا ہے ایسی بات کہتا ہے کہ نہ دیکھی ہو نہ سُنی ہو۔ یہ مُونچھوں پر تاؤ دیکر بولے کہ حضور کے اقبال سے قیامت تک ایسی ہی کہے جاؤنگا کہ نہ دیکھی ہو۔ نہ سُنی ہو۔ نواب تو ناک بھوں چڑھا بیٹھے چین بجبیں ہوکر بولے کہ بھلا زیادہ نہیں! فقط دو لطیفے روز سُنا دیا کیجئے۔ مگر شرط یہی ہے۔ کہ نہ دیکھے ہوں نہ سُنے ہوں نہیں تو خیر نہ ہوگی۔

سیّد انشاء سمجھ گئے کہ یہ انداز کچھ اور ہیں۔ خیر اُس دن سے دو لطیفے روز تو اُنھوں نے سُنانے شروع کر دیئے۔ مگر چند روز میں یہ عالم ہوگیا کہ دربار کو جانے لگتے تو جو پاس بیٹھا ہوتا۔ اُسی سے کہتے کہ کوئی نقل۔ کوئی چٹکلہ یاد ہو تو بتاؤ۔ ذرا نواب کو سُنائیں۔ وہ کہتا

کہ جناب بھلا آپ کے سامنے اور ہم چٹکلے کہیں ! یہ کہتے کہ میاں کوئی بات چڑباکی۔ چنونے کی جو تمہیں یاد ہو کہہ دو میں لون مرچ لگاکر اسے خوش کر لونگا۔ اسی اثنا میں ایک دن ایسا ہوا کہ سعادت علی خاں نے انہیں بلا بھیجا۔ یہ کسی اور امیر کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ چوبدار نے آکر عرض کی۔ کہ گھر نہیں ملے۔ خفا ہو کر حکم دیا کہ ہمارے سوا کسی اور کے ہاں نہ جایا کرو۔ اس قید بے زنجیر نے انہیں بہت دق کیا۔ زیادہ مصیبت یہ ہوئی کہ لعالی اللہ خاں نوجوان بیٹا مرگیا۔ اس صدمہ سے حواس میں فرق آگیا۔ یہاں تک کہ ایک دن سعادت علیخاں کی سواری ان کے مکان کی طرف سے نکلی۔ کچھ غم و غصّہ کچھ دل بے قابو غرض سر راہ کھڑے ہو کر سخت و سست کہا۔ سعادت علی خاں نے جا کر تنخواہ بند کر دی اب جنون میں کیا کسر رہی ؛

سیّد انشا کا انجام

سعادت یار خاں رنگین۔ ان کے بڑے یار تھے۔ اور

دستار بدل بھائی تھے۔ چنانچہ سیّد انشاء خود کہتے ہیں ؎

عجب رنگینیاں ہوتی ہیں کچھ باتوں میں اے انشاء
بہم مل بیٹھتے ہیں جب سعادت یار خاں اور ہم

خان موصوف کہا کرتے تھے۔ کہ لکھنؤ میں سیّد انشاء کے
کے وہ رنگ دیکھے۔ جن کا خیال کر کے دنیا سے جی بیزار
ہوتا ہے۔ ایک تو وہ اوج کا زمانہ تھا کہ سعادت علیخاں
کی ناک کے بال تھے۔ اپنی کمال لیاقت اور شگفتہ مزاجی کے
سبب سے مرجع خلایق تھے دروازے پر گھوڑے۔ ہاتھی
پالکی۔ نالکی کے ہجوم سے رستہ نہ ملتا تھا۔

دوسری وہ حالت کہ پھر جو میں لکھنؤ گیا تو دیکھا کہ
ظاہر درست تھا۔ مگر درخت اقبال کی جڑ کو دیمک لگ
گئی تھی۔ میں ایک شخص کی ملاقات کو گیا۔ وہ اثنائے گفتگو
میں دوستان دنیا کی نا آشنائی اور بیوفائی کی شکایت کرنے
لگے۔ میں نے کہا البتہ ایسا ہے مگر پھر بھی زمانہ خالی نہیں۔
انہوں نے زیادہ مبالغہ کیا میں نے کہا کہ ایک ہمارا دوست
انشاء ہے۔ کہ دوست کے نام پر جان دینے کو موجود ہے۔
وہ خاموش ہوئے اور کہا کہ اچھا زیادہ نہیں۔ آج آپ

اُن کے پاس جائیے - اور کہیئے ہمیں ایک تربوز خود بازار
سے لاکر کھلا دو - موسم کا میوہ ہے کچھ بڑی بات بھی
نہیں ہے - میں نے کہا کہ بھلا یہ بھی کچھ فرمایش ہے - وہ
بولے - بس یہی فرمایش ہے - مگر شرط یہ ہے کہ وہ خود لاکر
کھلائیں - بلکہ چار آنے کے پیسے بھی آپ مجھ سے لیجائیں
میں اُسی وقت اُٹھ کر پہنچا - انشاء عادت قدیم کے بموجب
دیکھتے ہی دوڑے - صدقہ قربان گئے - جم جم آیئے - نت
نت آیئے - بلائیں لینے لگے - میں نے کہا یہ ناز و انداز
ذرا طاق میں رکھو - پہلے ایک تربوز تو لاکر کھلاؤ - گرمی
نے مجھے جلا دیا - اُنہوں نے آدمی کو پکارا - میں نے کہا کہ
آدمی کی سہی نہیں - تم آپ جاؤ - اور ایک اچھا سا
شہیدی تربوز دیکھ کر لاؤ - اُنہوں نے کہا کہ نہیں
آدمی معقول ہے - اچھا ہی لائیگا - میں نے کہا نہیں -
کھاؤنگا تو تمہارا ہی لایا ہوا کھاؤں گا - اُنہوں نے کہا -
تو دیوانہ ہوا ہے ! یہ بات کیا ہے ؟ تب میں نے
داستان سُنائی - اُس وقت انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس
بھری اور کہا کہ بھائی وہ شخص سچا اور ہم تم دونوں جھوٹے -

کیا کروں! ظالم کی قید میں ہوں۔ سوا دربار کے گھر سے نکلنے کا حکم نہیں۔

تیسرا رنگ میاں رنگین بیان کرتے ہیں۔ کہ میں سوداگری کے لئے گھوڑے لے کر لکھنؤ گیا۔ اور سرا میں اُترا شام ہوئی تو معلوم ہُوا کہ قریب ہی مشاعرہ ہونا ہے۔ کھانا کھا کر میں بھی جلسہ میں پہنچا۔ ابھی دو تین سو آدمی آئے تھے۔ لوگ بیٹھے باتیں کرتے تھے۔ حُقّے پی رہے تھے۔ میں بھی بیٹھا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ ایک شخص میلی کچیلی رُوئی دار مرزئی پہنے۔ سر پہ ایک میلا سا پھینٹا۔ گھُٹنّا پاؤں میں۔ گلے میں پیکیوں کا توبڑا ڈالے ایک ٹکڑ کا حُقّہ ہاتھ میں لئے آیا۔ اور سلام علیکم کہہ کر بیٹھ گیا۔ کسی کسی نے اُس سے مزاج پرسی بھی کی۔ اُس نے اپنے توبڑے میں ہاتھ ڈال کر تمبا کو نکالا۔ اور اپنی چلم پر سلفا جما کر کہا کہ بھئی ذرا سی آگ ہو تو اس پہ رکھ دینا۔ اُسی وقت آوازیں بلند ہوئیں۔ اور گرد گرد ہی سٹک پیچوان سے لوگ تواضع کرنے لگے۔ وہ بیدماغ ہو کر بولا کہ صاحب! ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو۔ نہیں تو ہم جاتے ہیں۔ سب نے اس کی بات کے لئے تسلیم اور تعمیل کی۔ دم بھر کے بعد پھر بولا کہ کیوں حضرت

ابھی مشاعرہ شروع نہیں ہوا۔ لوگوں نے کہا۔ جناب لوگ جمع ہوتے جاتے ہیں۔ سب صاحب آجائیں تو شروع ہو۔ وہ بولا کہ صاحب ہم تو اپنی غزل پڑھے دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر تو بڑے میں سے ایک کاغذ نکالا اور غزل پڑھنی شروع کر دی :-

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی!
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
تصوّر عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن اس گھڑی مےخوار بیٹھے ہیں
بسانِ نقش پائے رہرواں کوئے تمنّا میں
نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں!
کہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے
میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دَور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاء
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

وُہ تو غزل پڑھ۔ کاغذ پھینک۔ سلام علیک کہہ کر چلے گئے۔ مگر زمین و آسمان میں سناٹا ہو گیا۔ اور دیر تک دلوں پر ایک عالم رہا۔ جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ غزل پڑھنے میں میں نے بھی پہچانا۔ حال معلوم کیا۔ تو بہت رنج ہوا۔ اور گھر جا کر پھر ملاقات کی۔

چوتھی دفعہ جو لکھنؤ گیا تو پوچھتا ہوا گھر پہنچا۔ افسوس جس دروازہ پر ہاتھی جھومتے تھے۔ وہاں دیکھا کہ خاک اُڑتی ہے۔ اور کتے لوٹتے ہیں۔ ڈیوڑھی پہ دستک دی۔ اندر سے کسی بڑھیا نے پوچھا کہ کون ہے بھائی۔ (وہ ان کی بی بی تھیں) میں نے کہا کہ سعادت یار خاں دلّی سے آیا ہے۔ چونکہ سیّد انشاء سے انتہا درجہ کا اتحاد تھا۔ اس عفیفہ نے پہچانا اور دروازہ پر بہت روئیں اور کہا کہ بھیّا اُن کی تو عجب حالت ہے۔ اے لو میں ہٹ جاتی ہوں۔ تم اندر آؤ۔ اور

دیکھ لو۔ میں اندر گیا۔ دیکھا کہ ایک کونے میں بیٹھے ہیں۔ تن برہنہ ہے۔ دونو زانوؤں پر سر دھرا ہے۔ آگے راکھ کے ڈھیر ہیں ایک لوٹا سا حقّہ پاس رکھا ہے۔ یا تو وہ شان و شکوہ کے جمگھٹ دیکھے تھے۔ وہ گرمجوشی اور چہلوں کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ یا یہ حالت دیکھی بے اختیار دل بھر آیا۔ میں بھی وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ اور دیر تک رو دیا۔ جب جی ہلکا ہوا۔ تو میں نے پکارا کہ سیّد انشاؔ سیّد انشاؔ سر اٹھا کر اس نظرِ حسرت سے دیکھا جو کہتی تھی کیا کروں۔ آنکھ میں آنسو نہیں۔ میں نے کہا کیا حال ہے۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ شکر ہے۔ پھر اس طرح سر کو گھٹنوں پر رکھ لیا کہ نہ اٹھایا۔

بعض فلاسفہ کا قول ہے کہ مدت حیات ہر انسان کی سانسوں کے شمار پر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہر شخص جس قدر سانس یا جتنا رزق اپنا حصّہ لایا ہے۔ اسی طرح ہر شئے کہ جس میں خوشی کی مقدار۔ اور ہنسی کا اندازہ بھی داخل ہے۔ وہ لکھوا کر لایا ہے سیّد موصوف نے اس ہنسی کی مقدار کو جو عمر بھر کے لئے تھی تھوڑے وقت میں صرف کر دیا۔ باقی وقت یا خالی رہا۔ یا غم کا حصّہ ہو گیا

مصحفی کا شوق کمال

شوق کمال کا یہ حال تھا کہ لکھنؤ میں ایک شخص کے پاس کلیاتِ نظیری تھا۔ اس زمانہ میں کتاب کی قدر بہت تھی۔ مالک اُس کا بہ سبب نایابی کے کسی کو عاریتہً بھی نہ دیتا تھا۔ مصحفی سے اتنی بات پر راضی ہوا کہ خود آکر ایک جزو لیجایا کرو۔ وہ دیکھ لو تو واپس کرکے اور لے جایا کرو۔ ان کا گھر شہر کے اس کنارہ پہ تھا۔ اور وہ اُس کنارہ پر۔ چنانچہ معمول تھا کہ ایک دن درمیان وہاں جاتے اور جزو بدل کر لے آتے۔ ایک دفعہ جب وہاں سے لاتے تو پڑھتے آتے۔ گھر پر آکر نقل یا خلاصہ کرتے اور جاتے ہوئے پھر پڑھتے جاتے۔ ہم لوگوں کے حال پہ افسوس ہے۔ کہ آج چھاپہ کی بدولت وہ وہ کتابیں دوکانوں میں پڑی ہیں۔ جو ایک زمانہ میں دیکھنے کو نصیب نہ ہوتی تھیں۔ مگر بے پروائی ہمیں آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھنے دیتی۔ تعجب ہے اُن لوگوں سے جو شکایت کرتے ہیں۔ کہ

پہلے بزرگوں کی طرح اب لوگ صاحب کمال نہیں ہوتے۔ پہلے جو لوگ کتاب دیکھتے تھے تو اُس کے مضمون کو اس طرح دل و دماغ میں بٹھتے تھے۔ جس سے اس کے اثر دلوں میں نقش ہوتے تھے۔ آج کل کے لوگ پڑھتے بھی ہیں۔ تو اس طرح صفحوں سے عبور کر جاتے ہیں۔ گویا بکریاں ہیں کہ باغ میں گھس گئی ہیں جہاں مُنہ پڑ گیا ایک بکٹا بھی بھر لیا۔ باقی کچھ خبر نہیں۔ ہوس کا چرواہا اُن کی گردن پر سوار ہے۔ وُہ دبائے لئے جاتا ہے۔ یعنی امتحان پاس کر کے ایک سند لو اور کوئی نوکری لے کر بیٹھ رہو۔ اور افسوس یہ ہے کہ نوکری بھی نصیب نہیں ؛

ان کی مشاقی اور پرگوئی کو سب تذکروں میں تسلیم کیا ہے۔ سن رسیدہ لوگوں کی زبانی سُنا کہ دو تین تختیاں پاس دھری رہتی تھیں۔ جب مشاعرہ قریب ہوتا۔ تو اُن پر اور مختلف کاغذوں پر طرح مشاعرہ میں شعر لکھنے شروع کرتے

تھے۔ اور برابر لکھتے جاتے تھے۔ لکھنؤ شہر تھا۔ عین مشاعرہ کے دن لوگ آتے۔ ۸ر سے ۸ر تک اور جہاں تک کسی کا شوق مدد کرتا۔ رہ دیتا۔ یہ اُس میں سے ۹۔۱۰۔ ۱۲ شعر کی غزل نکال کر حوالہ کر دیتے تھے۔ اُن کے نام کا مقطع کر دیتے تھے۔ اور اصل سبب کمزوری کا یہ تھا۔ کہ بڑھاپے میں شادی بھی کی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے تو ایک سالا تھا وہ شعر چُن کر لے جاتا۔ پھر سب کو دے لے کر جو کچھ بچتا وہ خود لیتے۔ اور اُس میں لون مرچ لگا کر مشاعرہ میں پڑھ دیتے وہی غزلیں دیوانوں میں لکھی چلی آتی ہیں۔ بلکہ ایک مشاعرہ میں جب شعروں پر بالکل تعریف نہ ہوئی تو اُنھوں نے تنگ ہو کر غزل زمین پہ دے ماری اور کہا کہ روئے فلاکت سیاہ جس کی بدولت کلام کی یہ نوبت پہنچی ہے۔ کہ اب کوئی سنتا بھی نہیں۔ اس بات کا چرچہ ہوا تو یہ عقدہ کھُلا کہ ان کی غزلیں بکتی ہیں۔ اچھے اچھے شعر تو لوگ مول لے جاتے ہیں جو رہ جاتے ہیں۔ وہ ان کے حصہ میں آتے ہیں۔

مصحفی کی روانیٔ طبع

پانی پت کے ایک شخص اُس زمانہ میں چکلہ داری کے سبب سے لکھنؤ میں رہتے تھے۔ اُن کے ہاں شیخ مصحفی بھی آیا کرتے تھے۔ ایک دن کاغذ کا جزو ہاتھ میں لئے ہوئے آئے اور الگ بیٹھ کر کچھ لکھنے لگے۔ سامنے ایک ورق رکھا تھا۔ اُسے دیکھ دیکھ کر اس طرح لکھے جاتے تھے۔ جیسے کوئی نقل کرتا ہے۔ ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا ہے؟ جسکی آپ نقل کر رہے ہیں لائیے میں لکھ دوں۔ اُنہوں نے کہا کہ ایک شخص نے کچھ مضمون مثنوی میں لکھوانے کے لئے فرمایش کی تھی۔ اُس کا تقاضا مدت سے تھا۔ کچھ تو مجھے یاد نہ رہتا تھا۔ کچھ فرصت نہ ہوتی تھی۔ آج اُس نے بہت شکایت کی اور مطلب لکھ کر دے دیا۔ وہ نظم کر رہا ہوں۔ اس سے روانی طبع اور مشق سخن کو قیاس کرنا چاہیئے ؎

ناسخ

ناسخ کو ورزش کا شوق

ناسخ کو ابتدائے عمر سے ورزش کا شوق تھا۔ خود ورزش کرتے تھے۔ بلکہ احباب کے نوجوانوں میں جو حاضر خدمت ہوتے اور ان میں کسی ہونہار کو ورزش کا شوق دیکھتے تو خوش ہوتے اور چونپ دلاتے۔ ۱۲۹۷ ڈنڑ کا معمول تھا کہ یا غفور کے عدد ہیں یہ وظیفہ قضا نہ ہوتا تھا۔ البتہ موقع اور موسم پر زیادہ ہو جاتے تھے۔ انہیں جیسا ریاضت کا شوق تھا۔ ویسا ہی ڈیل ڈول بھی لائے تھے۔ بلند بالا۔ فراخ سینہ۔ منڈا ہوا سر۔ کہاروے کا لنگ باندھے بیٹھے رہتے تھے۔ جیسے شیر بیٹھا ہے۔ جاڑے میں تن زیب کا کرتا۔ بہت ہوا تو لکھنؤ کی چھینٹ کا دوہرا کرتا پہن لیا۔

دن رات میں ایک دفعہ کھانا کھاتے تھے۔ ظہر کے وقت

دستر خوان پر بیٹھتے تھے۔ اور کئی وقتوں کی کسر نکال لیتے تھے۔
پان سیر بخنہ وزن شاہجہانی کی خوراک تھی۔ خاص خاص میوؤں
کی فصل ہوتی۔ تو جس دن کسی میوہ کو جی چاہتا۔ اُس دن کھانا
موقوف۔ مثلاً جامنوں کو جی چاہا۔ لگن اور سینیاں بھر کر بیٹھ جاتے
۴۔ ۵ سیر وہی کھا ڈالیں۔ آموں کا موسم ہے۔ تو ایک دن کئی
ٹوکرے منگا کر سامنے رکھ لئے۔ ناندوں میں پانی ڈلوالیا۔ اُن
میں بھرے اور خالی کرکے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بھٹّے کھانے بیٹھے
تو گلّیوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ اور یہ اکثر کھایا کرتے تھے۔ دُودھیا
بھٹّے چنے جاتے۔ چاقو سے دانوں پر خط ڈال کر لون مرچ لگتا
سامنے بھنتے ہیں۔ لیمو چھڑکتے ہیں اور کھاتے جاتے ہیں۔ میوہ خوری
ہر فصل میں دو تین دفعہ۔ بس اور اس میں دو چار دوست بھی
شامل ہو جاتے تھے۔

کھانا اکثر تخلیہ میں کھاتے تھے۔ سب کو وقت معلوم تھا۔
جب ظہر کا وقت قریب ہوتا تھا۔ تو رخصت ہو جاتے تھے (رعمی
سلمہ اللہ فرماتے ہیں) مجھے چند مرتبہ ان کے ساتھ کھانے کا
اتفاق ہوا۔ اس دن نہاری اور نان تا فتاں بھی بازار سے منگائی
تھی۔ پانچ چار پیالوں میں قورمہ۔ کباب۔ ایک میں کسی پرندہ کا

قورمہ تھا۔ شلغم تھے۔ چقندر تھے۔ ارہر کی دال۔ دھوئی ماش کی دال تھی۔ اور وہ دسترخوان کا شیر اکیلا تھا۔ مگر سب کو فنا کر دیا۔ یہ بھی قاعدہ تھا کہ ایک پیالہ میں سے جتنا کھانا ہے۔ خوب کھا لو۔ اُسے خدمتگار اٹھا لیگا۔ دوسرا سامنے کر دیگا۔ یہ نہ ہو سکتا تھا کہ ایک نوالہ کو دو سالنوں میں ڈال کر کھا لو۔ کہا کرتے تھے۔ کہ ملا جُلا کر کھانے میں چیز کا مزہ جاتا رہتا ہے۔ اخیر میں پلاؤ۔ چلاؤ یا خشکہ کھاتے تھے۔ پھر دال اور ۵۔ ۶ نوالوں کے بعد ایک نوالہ چٹنی یا اچار یا مربّے کا۔ کہا کرتے تھے کہ تم جوانوں سے تو میں بڈھا ہی اچھا کھانا ہوں۔ دسترخوان اُٹھتا تھا۔ تو دو خوان فقط خالی باسنوں کے بھرے اُٹھتے تھے۔ قوی ہیکل بلونت جوان تھے۔ اُن کی صورت دیکھ کر معلوم ہوتا تھا۔ کہ ۴۔ ۵ سیر کھانا اُن کے آگے کیا مال ہے۔

زمانہ کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ بے ادب گستاخ دُم کٹے بھینسے کی پھبتی کہا کرتے تھے۔

آغا کلب حسین خاں مرحوم انہیں اکثر بلایا کرتے تھے۔ اور مہینوں مہمان رکھتے تھے۔ ان سے فقط ذوقِ شعر کا تعلق نہ تھا وہ بھی ایک شہزور۔ شہ سوار۔ ورزشی جوان تھے۔ سامان

امیرانہ اور مزاج دوستانہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر کہ آغا صاحب سورام سرحد نوابی پر تحصیلدار ہو کر آئے۔ شیخ صاحب کو بُلا بھیجا۔ کہ چند روز سبزہ و صحرا کی سیر سے طبیعت کو سیراب فرمایئے ایک دن بعض اقسام کے کھانے خاص شیخ صاحب کی نسبت سے پکوائے تھے۔ اس لئے وقت معمول سے کچھ دیر ہو گئی۔ شیخ صاحب نے دیکھا کہ حرم سرا کی ڈیوڑھی سے نوکر اپنے اپنے کھانے لے کر نکلے۔ بلا کر پُوچھا کہ یہ کِس کے لئے ہے؟ عرض کی ہمارا کھانا ہے۔ فرمایا۔ اِدھر لاؤ۔ ان میں سے ۴-۵ کا کھانا سامنے رکھوا لیا چاٹ پُونچھ کر باسن حوالے کئے اور کہا کہ ہمارا کھانا آئیگا۔ تو تم کھا لینا۔ آغا صاحب کو خبر پہنچی۔ اتنے میں وہ آئے یہاں کام ختم ہو چکا تھا۔

عجیب ڈھکوسلا

لکھنؤ کے امیرزادے جنہیں کھانے کے ہضم کرنے سے زیادہ کوئی کام دُشوار نہیں ہوتا۔ اُن کے وقت گذارنے کیلئے

مصاحبوں نے ایک عجیب چورن تیار کیا۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ صاحب سے ایک جن کو محبّت تھی۔ اُن کا معمول تھا ورزش کے بعد صبح کو ایک بینی پراٹھا گھی میں تر تراتا کھایا کرتے تھے۔ اوّل اوّل ایسا ہوتا رہا کہ جب کھانے بیٹھتے۔ پراٹھا برابر غائب ہوتا چلا جاتا۔ یہ سوچتے مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آتی۔ بالاخانہ میں دروازہ بند کرکے اکیلے ورزش کیا کرتے تھے۔ ایک دن مگدر ہلا رہے تھے۔ دیکھتے ہیں۔ ایک شخص اور سامنے کھڑا مگدر ہلا رہا ہے۔ حیران ہوئے۔ بدن میں جوانی اور پہلوانی کا بل تھا۔ لپٹ گئے۔ تھوڑی دیر زور ہوتا رہا۔ اسی عالم میں پوچھا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا کہ تمہاری ورزش کا انداز پسند آیا ہے۔ اس لئے کبھی کبھی ادھر آنکلتا ہوں۔ اکثر کھانے میں بھی شریک ہوتا ہوں۔ مگر بغیر اظہار کے محبت کا مزہ نہیں آتا۔ آج ظاہر کیا۔ اس دن سے ان کی اُن کی راہ ہوگئی۔ پُرخوری کے سبب سے لوگ کہتے تھے کہ اِن کے پیٹ میں جن ہے۔

ناسخ اور شائقین کلام

کوئی ناواقف شخص شائق کلام آتا۔ تو چند بے معنی غزلیں

بنا رکھی تھیں۔ اُن میں سے کوئی شعر پڑھتے۔ یا اُسی وقت چند بے ربط الفاظ جوڑ کر موزوں کر لیتے اور سُناتے۔ اگر وہ سوچ میں جاتا اور چُپ رہ جاتا تو سمجھتے تھے کہ سمجھتا ہے اُسے اور سُناتے تھے۔ اور اگر اُس نے بے تحاشا تعریف کرنی شروع کر دی۔ تو اسی طرح کے ایک دو شعر پڑھ کر چُپکے ہو رہتے تھے۔ مثلاً

آدمی مخمل میں دیکھے مورچے بادام میں

ٹوٹی دریا کی کلائی زُلف اُلجھی بام میں

تُو نے ناسخ وہ غزل آج لکھی ہے کہ ہُوا

سب کو مُشکل یدِ بیضا میں سخن داں ہونا

بلکہ اکثر خود سُناتے بھی نہ تھے۔ جب کوئی آتا اور شعر کی فرمایش کرتا تو دیوان اُٹھا کر سامنے رکھ دیتے تھے۔ کہ اس میں سے دیکھ لیجئے۔ دو تین خوشنویس کاتب بھی نوکر رہتے تھے۔ دیوان کی نقلیں جاری تھیں۔ جس دوست یا شاگرد کو لایق اور شایق دیکھتے اُسے عنایت فرماتے تھے۔ وہ بہت خوش اخلاق تھے۔ مگر اپنے خیالات میں ایسے محو رہتے تھے کہ ناواقف شخص خشک مزاج یا بد دماغ سمجھتا تھا۔

سیّد مہدی حسن فروغ مرحوم۔ میاں بیتاب کے شاگرد تھے۔

اور زبان ریختہ کے کہن سال مشاق تھے۔ نقل فرماتے تھے۔ کہ ایک دن میں شیخ صاحب کی خدمت میں گیا۔ دیکھا کہ چوکی پہ بیٹھے نہار ہے ہیں۔ آس پاس چند احباب موڈھوں پر بیٹھے ہیں میں سامنے جاکر کھڑا ہوا۔ اور سلام کیا۔ اُنہوں نے ایک آواز سے جوکہ اُن کے بدن سے بھی فربہ تھی۔ فرمایا کہ کیوں صاحب کس طرح تشریف لانا ہوا؟ میں نے کہا کہ ایک فارسی کا شعر کسی اُستاد کا ہے۔ اُس کے معنے سمجھ میں نہیں آتے۔ فرمایا کہ فارسی کا شاعر نہیں۔ اتنا کہہ کر اور شخص سے باتیں کرنے لگے۔ میں اپنے جانے پر بہت پچھتایا۔ اور اپنے تئیں ملامت کرتا چلا آیا۔ ؎

ایک دن کوئی شخص ملاقات کو آئے۔ ناسخ اُسوقت چند دوستوں کو لئے انگنائی میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ شخص مذکور کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اور اتفاقاً پاؤں کے آگے ایک

مٹی کا ڈھیلا پڑا تھا۔ وہ شغلِ بیکاری کے طور پر جیسے کہ اکثر اشخاص کو عادت ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ لکڑی کی نوک سے ڈھیلے کو توڑنے لگے۔ شیخ صاحب نے نوکر کو آواز دی۔ حاضر ہوا۔ فرمایا کہ میاں! ایک ٹوکری مٹی کے ڈھیلوں کی بھر کر ان کے سامنے رکھ دو۔ دل لگا کر شوق پورا کریں۔

شاہ غلام اعظم افضل ان کے شاگرد اکثر حاضرِ خدمت ہوتے تھے۔ ایک دن آپ تخت پر بیٹھے تھے۔ اس پر سینتل پاٹی کا بوریا بچھا تھا۔ افضل آئے وہ بھی اُسی پر بیٹھ گئے۔ اس پر سینتل پاٹی کا ایک تنکا توڑ کر چٹکی سے توڑنے اور مروڑنے لگے۔ شیخ صاحب نے آدمی کو بُلا کر کہا کہ بھائی وہ جو آج نئی جھاڑو تم بازار سے لائے ہو۔ ذرا لے آؤ۔ اس نے حاضر کی۔ خود لے کر شاہ صاحب کے سامنے رکھدی اور کہا۔ صاحبزادے اس سے شغل فرمایئے۔ فقیر کا بوریا آپ کے تھوڑے سے التفات سے برباد ہو جائے گا۔ پھر سینتل پاٹی اس شہر میں کہاں ڈھونڈھتا پھرے گا۔ وہ بیچارے شرمندہ ہو کر رہ گئے ؎

آغا کلب عابد خانصاحب فرماتے تھے۔ کہ ایک دفعہ شیخ صاحب کے واسطے کسی شخص نے دو تین چمچے بطریق تحفہ بھیجے کہ شیشے کے تھے۔ ان دنوں نیا ایجاد سمجھے جاتے تھے۔ اور حقیقت میں بہت خوشنما تھے۔ وہ پہلو میں طاق پر رکھے تھے۔ ایک امیر صاحبزادے آئے۔ اُس طرف دیکھا اور پوچھا کہ حضرت یہ چمچے کہاں سے خریدے۔ اور کس قیمت کو خریدے شیخ صاحب نے حال بیان کیا۔ اُنہوں نے ہاتھ بڑھا کر ایک چمچہ اٹھا لیا۔ دیکھ کر تعریف کی۔ پھر باتیں چیتیں کرتے رہے۔ اور چمچہ سے زمین پر کھٹکا دیکر شغل بے شغلی فرماتے رہے۔ شیشہ کی بساط کیا تھی۔ ٹھیس زیادہ لگی جھٹ سے دو ٹکڑے۔ شیخ صاحب نے دوسرا چمچہ اٹھا کر سامنے رکھ دیا اور کہا کہ اب اس سے شغل فرمایئے۔

ناسخ کی نازک طبعی

ایک دن ناسخ اپنے خانہ باغ کے بنگلہ میں بیٹھے تھے۔

اور فکر مضمون میں غرق تھے۔ ایک شخص آکر بیٹھے۔ ان کی طبیعت پریشان ہوئی۔ اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔ کہ یہ اُٹھ جائیں ناچار پھر آ بیٹھے۔ مگر وہ نہ اُٹھے۔ کسی ضرورت کے بہانے سے پھر گئے۔ کہ یہ سمجھ جائیں گے۔ وہ پھر بھی نہ سمجھے۔ انہوں نے چلم میں سے چنگاری اُٹھا کر بنگلہ کی ٹٹی میں رکھ دی اور آپ لکھنے لگے۔ ٹٹی جلنی شروع ہوئی۔ وہ شخص گھبرا کر اُٹھے اور کہا کہ شیخ صاحب آپ دیکھتے ہیں؟ یہ کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا کہ جاتے کہاں ہو؟ اب تو مجھے اور تمہیں جل کر راکھ کا ڈھیر ہونا ہے۔ تم نے میرے مضامین کو خاک میں ملایا ہے۔ میرے دل کو جلا کر خاک کیا ہے۔ اب کیا تمہیں جانے دُونگا۔

اِسی طرح ایک شخص نے بیٹھ کر انہیں تنگ کیا۔ نوکر کو بلا کر صندوقچہ منگایا۔ اس میں سے مکان کے قبالے نکال کر اُن کے سامنے دھر دیئے۔ اور نوکر سے کہا کہ بھائی مزدوروں کو بلا لو اور اسباب اُٹھا کر لے چلو۔ اِدھر وہ شخص حیران اُن کا مُنہ دیکھے۔ اُدھر نوکر حیران۔ آپ نے کہا دیکھتے کیا ہو مکان پر تو یہ قبضہ کر چکے ایسا نہ ہو کہ اسباب بھی ہاتھ سے

جاتا رہے ۔

آتش سے معرکہ

ایک نواب صاحب کے ہاں مشاعرہ تھا۔ وہ اِن کے معتقد تھے۔ اُنہوں نے ارادہ کیا شیخ صاحب جب غزل پڑھ چکیں تو اُنہیں سرِ مشاعرہ خلعت دیں۔ یار لوگوں نے خواجہ آتش صاحب کے پاس مصرع طرح نہ بھیجا۔ انہیں اُس وقت مصرع پہنچا۔ جب ایک دن مشاعرہ میں باقی تھا۔ خواجہ صاحب بہت خفا ہوئے اور کہا کہ اب لکھنؤ رہنے کا مقام نہیں۔ ہم نہ رہیں گے۔ شاگرد جمع ہوئے۔ اور کہا کہ آپ کچھ خیال نہ فرمائیں۔ نیاز مند حاضر ہیں۔ دو دو شعر کہیں گے تو صدہا شعر ہو جائینگے وہ بہت تند مزاج تھے۔ اُن سے بھی ویسی ہی تقریریں کرتے رہے۔ شہر کے باہر چلے گئے۔ پھرتے پھرتے ایک مسجد میں جا بیٹھے وہاں سے غزل کہہ کر لائے۔ اور مشاعرے میں گئے۔ تو ایک قرابین بھی بھر کر لیتے گئے۔ بیٹھے ایسے موقع پر تھے کہ عین

مُقابل شیخ صاحب کے تھے۔ اوّل تو آپ کا انداز ہی بانکے سپاہیوں کا تھا۔ اس پر قرابین بھری سامنے رکھی تھی۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ خود بھی بھرے بیٹھے ہیں۔ بار بار قرابین اُٹھاتے تھے۔ اور رکھ دیتے تھے۔ جب شمع سامنے آئی تو سنبھل کر ہو بیٹھے اور شیخ صاحب کی طرف اشارہ کرکے پڑھا ؎

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

اِس ساری غزل میں کہیں ان کے بے پالک ہونے پر۔ کہیں ذخیرہ دولت پر۔ کہیں ان کے سامانِ امارت پر۔ غرض کچھ نہ کچھ چوٹ ضرور ہے۔ شیخ صاحب بیچارے دم بخود بیٹھے رہے۔ نواب صاحب ڈرے کہ خدا جانے یہ اُن پر قرابین خالی کریں یا میرے پیٹ میں آگ بھر دیں۔ اسی وقت داروغہ کو اشارہ کیا کہ دوسرا خلعت خواجہ صاحب کے لئے تیار کرو۔ غرض دونوں صاحبوں کو برابر خلعت دیکر رخصت کیا۔

ناسخ کی منصف مزاجی

اِن کے مزاج میں منصفی اور حق شناسی کا اثر ضرور تھا

چنانچہ الہ آباد میں ایک دن مشاعرہ تھا۔ سب موزوں طبع طرحی غزلیں کہہ کر لائے۔ شیخ صاحب نے جو غزل پڑھی۔ مطلع تھا ؎

دل اب محو ترسا ہُوا چاہتا ہے۔
یہ کعبہ کلیسا ہُوا چاہتا ہے

ایک لڑکے نے صف کے پیچھے سے سر نکالا۔ بھولی بھالی صُورت سے معلوم ہوتا تھا کہ معرکہ میں غزل پڑھتے ہوئے ڈرتا ہے۔ لوگوں کی دلدہی نے اُس کی ہمّت باندھی پہلا ہی مطلع تھا ؎

دِل اُس بُت پہ شیدا ہوا چاہتا ہے
خُدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے

محفل میں دُھوم مچ گئی۔ شیخ ناسخ نے بھی تعریف کرکے لڑکے کا دِل بڑھایا اور کہا کہ بھائی فیضانِ الٰہی ہے۔ اس میں اُستادی کا زور نہیں چلتا۔ تمہارا مطلع مطلعِ آفتاب ہے۔ میں اپنا پہلا مصرع غزل سے نکال ڈالوں گا۔

ناسخ اور آتش کی حاضر جوابیاں

ایک مشاعرہ میں ایسے وقت پہنچے۔ کہ جلسہ ختم ہو چکا تھا۔ مگر خواجہ حیدر علی آتش وغیرہ چند شعراء ابھی موجود تھے۔ یہ جا کر بیٹھے۔ تعظیم رسمی اور مزاج پرسی کے بعد کہا کہ جناب خواجہ صاحب مشاعرہ ہو چکا۔ انہوں نے کہا کہ سب کو آپ کا اشتیاق رہا۔ شیخ صاحب نے یہ مطلع پڑھا ؎

جو خاص ہیں وہ شریک گروہ عام نہیں
شمار دانہ تسبیح میں امام نہیں

چونکہ نام بھی امام بخش تھا۔ اس لیے تمام اہل جلسہ نے نہایت تعریف کی خواجہ صاحب نے یہ مطلع پڑھا ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لا خیر کا مقام نہیں   ہمارے گنجفہ میں بازی غلام نہیں

بعض اشخاص کی روایت ہے کہ یہ مطلع آتش کے شاگرد کا ہے۔ ناسخ کے شاگردوں کی طرف سے اُس کا جواب ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ لاجواب ہے ؎

جو خاص بندہ ہیں وہ بندۂ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

میر ضمیر

لکھنؤ میں چار مرثیہ گو نامی تھے۔ میر ضمیر اور میر خلیق۔ میاں دلگیر۔ میاں فصیح۔ میاں دلگیر کی زبان میں لکنت تھی۔ اس لئے مرثیہ خوانی نہ کرتے تھے۔ تصنیف میں بھی انہوں نے مرثیت کے دائرہ سے قدم نہیں بڑھایا۔

مرزا فصیح حج و زیارات کر گئے۔ اور وہیں سکونت پذیر ہوئے۔ میر ضمیر اور میر خلیق کے لئے میدان خالی رہا کہ جولانیاں

دکھائیں۔ دُنیا کے تماشائی جنھیں تیز طبیعتوں کے لڑانے میں
مزا آتا ہے۔ دونوں اُستادوں کی تعریفیں کرکے لڑاتے تھے۔
اور دل بہلاتے تھے۔ اور اس سے اُن کے ذہن کو کمال ورزش
اور اپنے دلوں کو چاشنی ذوق کی لذت دیتے تھے۔ مگر دونو
صاحب اخلاق اور سلامت روی کے قانون دان تھے۔ کبھی
ایک جلسہ میں جمع نہ ہوتے تھے۔

آخر ایک شوقین نیک نیت نے روپیہ کے زور اور حکمتِ
عملی کی مدد سے قانون کو توڑا۔ وہ بھی فقط ایک دفعہ۔ صورت
یہ کہ نواب شرف الدولہ مرحوم نے اپنے مکان پر مجلس قرار
دیکر سب خاص و عام کو اطلاع دی اور مجلس سے ایک دن
پہلے میر ضمیرؔ مرحوم کے مکان پر گئے۔ گفتگوئے معمولی کے بعد
پانسو روپیہ کا توڑا سامنے رکھ دیا۔ اور کہا کہ کل مجلس ہے مرثیہ
آپ پڑھیئے گا۔ بعد اس کے میر خلیقؔ کے ہاں گئے۔ اُن سے بھی
وہی مضمون ادا کیا۔ اور ایک کو دُوسرے کے حال سے آگاہ
نہ کیا۔ لکھنؤ شہر، روز معیّن پہ ہزار در ہزار آدمی جمع ہوئے
ایک بجے کے بعد میر ضمیرؔ منبر پر تشریف لے گئے۔ اور مرثیہ
پڑھنا شروع کیا۔ اِن کا پڑھنا سبحان اللہ مرثیہ نظم اور اُس پہ

نثر کے حاشیے کبھی رُلاتے تھے۔ اور کبھی تحسین و آفرین کا غُل مچواتے تھے۔ کہ میر خلیق بھی پہنچے۔ اور حالت موجودہ کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اور دل میں کہا کہ آج کی شرم بھی خدا کے ہاتھ ہے۔ میر ضمیر نے جب اُنہیں دیکھا تو زیادہ پھیلے اور مرثیہ کو اتنا طول دیا کہ آنکھوں میں آنسو اور لبوں میں تحسین بلکہ وقت میں گنجائش بھی نہ چھوڑی۔ آفتاب یوں ہی ساجھلکتا رہ گیا۔

وہ ابھی منبر سے اُترے ہی تھے۔ کہ چوبدار ان کے پاس آیا اور کہا کہ نواب صاحب فرماتے ہیں۔ آپ بھی حاضرین کو داخل حسنات فرمائیں۔ اس وقت ان کے طرفداروں کی بالکل صلاح نہ تھی۔ مگر یہ توکل بخدا اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور منبر پہ جا کر بیٹھے۔ چند ساعت توقف کیا۔ آنکھیں بند خاموش بیٹھے رہے۔ ان کی گوری رنگت۔ جسم نحیف و ناتواں۔ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ بدن میں لہو کی بوند ہے یا نہیں۔ جب انہوں نے رباعی پڑھی۔ تو اہل مجلس کو پوری آواز بھی نہیں سنائی دی۔ چند مرثیے کے بند بھی اس حالت میں گزر گئے۔ دفعتہً باکمال نے رنگ بدلا۔ اور اس کے ساتھ ہی محفل کا رنگ بھی بدلا۔ آہوں کا دھواں ابر کی طرح چھا گیا۔ اور نالہ و زاری نے آنسو برسانے شروع

گئے۔ ۱۵۔۲۰ بند پڑھے تھے کہ ایک دوسرے کا ہوش نہ رہا۔ ۲۵ یا ۳۰ بند پڑھ کر اتر آئے۔ اہلِ مجلس اکثر ایسی حالت میں تھے۔ کہ جب آنکھ اٹھا کر دیکھا تو منبر خالی تھا۔ نہ معلوم ہوا کہ میر خلیق صاحب کس وقت منبر سے اترآئے۔ دونو کے کمال پر صاد ہوا۔ اور طرفین کے طرفدار سرخرو گھروں کو پھرے۔

روایت مندرجہ بالا میر مہدی حسن چراغ کی زبانی سنی تھی۔ لیکن میر علی حسن رشک تخلص کہ میر عماد خوشنویس کی اولاد ہیں۔ خود ناسخ کے شاگرد اور صاحب دیوان ہیں۔ ان کے والد جنتی تخلص فقط مرثیہ کہتے تھے۔ اور میاں دلگیر کے شاگرد تھے میر اشک اب بھی حیدرآباد میں بزمرۂ منصبداراں ملازم ہیں۔ ان کی زبانی مولوی شریف حسین خاں صاحب نے بیان کیا۔ کہ لکھنؤ میں ایک غریب خوش اعتقاد شخص بڑے شوق سے مجلس کیا کرتا تھا۔ اور اسی رعایت سے ہر ایک نامی مرثیہ خواں اور لکھنؤ کے خاص و عام اُس کے ہاں حاضر ہوتے تھے۔ یہ معرکہ اس کے مکان پر ہوا تھا۔ اور میر ضمیر کے اشارے سے ہوا تھا۔ میر اشک فرماتے تھے کہ میر خلیق نے اپنے والد کے بعد چند روز بہت سختی سے زندگی بسر کی۔ عیال فیض آباد میں تھے۔

آصف الدولہ لکھنؤ میں رہنے لگے۔ اُن کے سبب سے تمام امرا یہیں رہنے لگے۔ میر موصوف لکھنؤ میں آتے تھے۔ سال بھر میں تین چار سو روپیہ حاصل کر کے لے جاتے تھے۔ اور پرورش عیال میں صرف کرتے تھے۔ صورت حال یہ تھی۔ کہ مرثیوں کا جزدان بغل میں لیا۔ اور لکھنؤ میں چلے آئے۔ یہاں ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت خال پڑی رہتی تھی۔ اس میں آ کر اُترتے تھے۔ ایک دفعہ وہ آئے۔ بستر رکھ کر آگ سلگائی تھی۔ آملا گوندھ رہے تھے۔ کہ شخص مذکور ہاتھ جوڑ کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ اور کہا حضور! مجلس تیار ہے۔ میری خوش نصیبی سے آپ کا تشریف لانا ہوا ہے۔ چل کر مرثیہ پڑھ دیجئے۔ یہ اُسی طرح اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ہاتھ دھو جزدان لے اس کے ساتھ ہو لئے۔ وہاں جا کر دیکھیں تو میر ضمیر منبر پہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہیں یہ معرکہ واقع ہوا اور اُسی دن سے میر خلیق نے مرثیہ خوانی میں شہرت پائی *

مومن کا نجوم میں کمال

ایک دن ایک غریب ہندو نہایت بیقرار اور پریشان آیا۔ حکیم مومن کے بیس برس کے رفیق ندیم شیخ عبدالکریم اُس وقت موجود تھے۔ مومن نے اُسے دیکھ کر کہا کہ تمہارا کچھ مال جاتا رہا ہے؟ اس نے کہا صاحب میں لُٹ گیا۔ کہا خاموش رہو جو مَیں کہوں اُسے سُنتے جاؤ۔ جو بات غلط ہو اُس کا انکار کر دینا پھر پوچھا کیا زیور کی قسم سے تھا؟ صاحب ہاں وہی عُمر بھر کی کمائی تھی۔ کہا تم نے لیا ہے یا تمہاری بیوی نے۔ کوئی غیر چُرانے نہیں آیا۔ اُس نے کہا میرا مال تھا اور بیوی کے پہننے کا زیور تھا۔ ہم کیوں چُراتے۔ ہنس کر فرمایا کہیں رکھ کر بھول گئے ہو گے۔ مال کہیں باہر نہیں گیا۔ اُس نے کہا۔ صاحب سارا گھر ڈھونڈا مارا۔ کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔ فرمایا پھر دیکھو۔ گیا اور سارے گھر میں اچھی طرح دیکھا۔ پھر آکر کہا۔ صاحب میرا چھوٹا سا گھر ہے۔ ایک ایک کونا دیکھ لیا۔ کہیں پتا نہیں لگتا۔ خانصاحب نے کہا اُسی گھر میں ہے۔ تم غلط کہتے ہو۔ کہا آپ

چل کر تلاشی لے لیجئے۔ میں تو ڈھونڈھ چکا۔ فرمایا میں یہیں سے بتاتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس کے سارے گھر کا نقشہ بیان کرنا شروع کیا۔ وہ سب باتوں کو تسلیم کرتا جاتا تھا۔ پھر کہا کہ اس گھر میں جنوب کے رُخ ایک کوٹھری ہے۔ اور اس میں شمال کی جانب ایک لکڑی کا مچان ہے۔ اس کے اُوپر مال موجود ہے جا کر لے لو۔ اُس نے کہا مچان کو تین دفعہ چھان مارا۔ وہاں نہیں ملا۔ فرمایا اسی کے ایک کونے میں پڑا ہے۔ غرض وہ گیا۔ اور جب روشنی کر کے دیکھا تو ڈبّا اور اس میں سارا زیور جوں کا توں سارا وہیں سے مل گیا۔

نواب الٰہی بخش کی سخاوتیں

نواب الٰہی بخش معروف

اُستاد ذوق فرماتے تھے کہ ایسا سخی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ جو آتا تھا۔ امیر۔ فقیر۔ غریب۔ محتاج۔ بچہ۔ بُوڑھا اُسے بغیر دیئے نہ رہتے تھے۔ اور دینا بھی وہی کہ جو اُس کے مناسب حال ہو۔ کوئی سوداگر نہ تھا۔ کہ آئے اور خالی پھر جائے۔

ایک دن میں ان کی غزل سنا رہا تھا۔ اس کا مقطع تھا

اک غزل پڑھ دردؔ کی معروف لکھ اس طرح میں

ذوق ہے دل کو نہایت دردؔ کے اشعار سے

کون روتا ہے یہ لگ کر باغ کی دیوار سے

جانور گرنے لگے جاتے تھے اشجار سے

سودا گر آیا اور اپنی چیزیں دکھانے لگا۔ ان میں ایک اصفہانی تلوار اچھی تھی۔ وہ پسند آئی۔ خم۔ دم۔ آبداری اور جوہر دیکھ کر تعریف کی۔ اور سپہری طاقت دیکھ کر کہا ع

اس کی صفحی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

میں نے اسی وقت دوسرا مصرع لگا کر داخل غزل کیا

بہت خوش ہوئے سہ

ہے لگا دل ابروئے خمدار کی پیوستہ میں آج

اس صفحی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

غرض اور چیزوں کے ساتھ وہ تلوار بھی لے لی۔ میں حیران ہوا کہ زمانہ ان کے معاملات و حالات سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتی۔ ایسے کیا کریں گے۔ خدا کی قدرت ۲۔۳ ہی دن کے بعد بڑے صاحب (فریزر صاحب ریذیڈنٹ دہلی) ایک اور صاحب کو اپنے ساتھ

لیکر نواب احمد بخش خاں مرحوم کی ملاقات کو آئے۔ وہاں سے ان کے پاس آئے اور بیٹھے۔ باتیں چیتیں ہوئیں۔ جو صاحب ساتھ تھے۔ ان سے ملاقات کروائی۔ جب چلنے لگے۔ تو انہوں نے وہی تلوار منگا کر صاحب کے ہمراہی کی کمر سے بندھوائی اور کہا ؎

برگ سبز است تحفہ درویش

چہ کند بے نوا ہمیں دارد

ان کے ساتھ میم صاحب بھی تھیں۔ ایک ارگن باجہ نہایت عمدہ کسی رومی سوداگر سے لیا تھا۔ وہ انہیں دیا۔

استاد ذوق فرماتے تھے کہ والان میں ایک طرف جانماز بچھی رہتی تھی۔ جب میں رخصت ہوتا تو آٹھویں دسویں دن فرماتے۔ بھئی ابراہیم ذرا ہماری جانماز کے نیچے دیکھنا۔ پہلے دن تو میں دیکھ کر حیران ہوا۔ کہ ایک پڑیا میں کچھ روپے دھرے تھے۔ آپ نے سامنے سے مسکرا کر فرمایا۔ ع

خدا دیوے تو بندہ کیوں نہ لیوے

اس میں لطیفہ یہ تھا کہ ہم کس قابل ہیں۔ جو کچھ دیں۔ جس سے ہم مانگتے ہیں۔ یہ وہی تمہیں دیتا ہے۔

ایک دفعہ استاد بیمار ہوئے اور کچھ عرصہ کے بعد گئے۔

ضعف تھا۔ اور کچھ کچھ شکایتیں باقی تھیں۔ فرمایا کہ حقّہ پیا کرو۔ عرض کی کہ بہت خوب۔ اب وہ حقہ پلوائیں تو خالی حقّہ پلوائیے ایک چاندی کی گڑگڑی۔ چلم اور چنبل۔ مُقرّق نیچہ۔ مرصع دہنال تیار کرواکر سامنے رکھوا دیا۔

خلیفہ صاحب (میاں محمد اسمٰعیل) چھوٹے سے تھے۔ ایک دن اُستاد کے ساتھ چلے گئے۔ رخصت ہوئے تو ایک چھوٹا سا ٹانگن اصطبل سے منگوایا۔ زین زرین کسا ہُوا۔ اُس پر سوار کر کے رُخصت کیا۔ کہ یہ بچہ ہے کیا جانے گا۔ کہیں کس کے پاس گیا تھا۔

اُستاد ذوق فرماتے تھے۔ کہ ایک دن میں بیٹھا غزل بنا رہا تھا۔ کہ نواب احمد بخش خاں آئے۔ آداب معمولی کے بعد باتوں باتوں میں کہنے لگے۔ کہ فلاں انگریز کی ضیافت کی۔ اتنا روپیہ اُس میں صرف ہُوا۔ فلانی گھوڑ دوڑ میں ایک چاہئے

پانی دیا تھا۔ یہ خرچ ہو گیا۔ وہ صاحب آئے تھے۔ اصطبل کی سیر دکھائی۔ کاٹھیا وار کے گھوڑوں کی جوڑی کھڑی تھی۔ اُنھوں نے تعریف کی۔ میں نے بگھی میں جُڑوائی۔ اور اسی پر سوار کر کے اُنہیں رخصت کیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیا کروں خالی ملنا خالی رخصت کرنا مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ یہاں کے امیروں کو امارت کے بڑے بڑے دعوے ہیں۔ (جس طرح بچے بزرگوں سے بگڑ بگڑ کر باتیں کرتے ہیں۔ چیں بجبیں ہوتے تھے اور کہتے تھے) فیل خانہ میں گیا تھا۔ وہاں یہ بندوبست کر آیا ہوں۔ گھوڑیاں آج سب علاقہ بھجوا دیں۔ حضرت کیا کروں۔ شہر میں اس گلہ کا گزارہ نہیں۔ یہ لوگ اس خرچ کا بوجھ اُٹھائیں۔ تو چھاتی تڑق جائے۔ الٰہی بخش خاں مرحوم بھی اداشناسی میں کمال ہی رکھتے تھے۔ تاڑ گئے۔ چپکے بیٹھے سنتے تھے اور مسکراتے تھے جب اُن کی زبان سے نکلا کہ چھاتی تڑق جائے۔ آپ مسکرا کر بولے۔ ہاں تو آپ کی چھاتی میں بھی آیا ہو گا۔ شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ پھر اُنہوں نے فرمایا۔ آخر امیرزادے ہو۔ خاندان کا نام ہے۔ یہی کرتے ہیں۔ مگر اس طرح نہیں کہا کرتے۔ نواب احمد بخش خاں نے کہا۔ حضرت پھر آپ سے بھی نہ کہوں؟ فرمایا

خُدا سے کہو۔ وُہ بولے کہ مجھے آپ دکھائی دیتے ہیں۔ آپ ہی سے کہتا ہُوں آپ خُدا سے کہیئے۔ فرمایا کہ اچھا ہم تم مِلکر کہیں۔ تمہیں بھی کہنا چاہیئے۔ نواب احمدؐ بخش خاں بھی جانتے تھے۔ کہ جو سخاوت ادھر ہوتی ہے۔ عین بجا ہے۔ اور اسی کی ساری برکت ہے۔

ایک دن نواب احمدؐ بخش خاں آئے۔ لیکن افسردہ اور پراشفتہ۔ الہٰی بخش خاں مرحوم سمجھ جاتے تھے کہ کچھ نہ کچھ آج ہے۔ جو اس طرح آئے ہیں۔ پُوچھا۔ آج کچھ خفا ہو؟ کہا نہیں حضرت۔ فیروز پُور جھرکہ جاتا ہُوں۔ پوچھا کیوں؟ کہا کہ بڑے صاحب (رزیڈنٹ) نے حکم دیا ہے کہ جس کو مِلنا ہو بدھ کو مُلاقات کرے۔ حضرت آپ جانتے ہیں۔ مجھے ہفتہ میں ۱۰۔ دفعہ کام پڑتے ہیں۔ جب جی چاہا گیا۔ جو ضرورت ہوئی کہہ سُن آیا۔ مجھ سے یہ پابندیاں نہیں اُٹھتیں۔ میں یہاں

رہنا ہی نہیں۔ فرمایا کہ تم سے کہا ہے۔ کہا کہ مجھ سے تو نہیں
کہا۔ سُنا ہے۔ بعض روساء گئے بھی تھے۔ اُن سے ملاقات نہ کی۔
یہی کہلا بھیجا کہ بُدھ کو ملئے۔ فرمایا کہ تمہارے واسطے نہیں۔
اوروں کے لئے ہوگا۔ احمد بخش خاں نے کہا کہ نہیں حضرت یہ
اہلِ فرنگ ہیں۔ ان کا قانون عام ہوتا ہے۔ جو سب کے لئے
ہے۔ وہی میرے لئے ہوگا۔ فرمایا کہ بھلا تو جاؤ۔ تم ابھی
جاؤ۔ دیکھو تو کیا ہوتا ہے۔ اُنہوں نے کہا بہت خوب جاؤنگا۔
فرمایا کہ جاؤنگا نہیں۔ اُٹھئے۔ بس ابھی جائیے۔ نواب نے کہا
کہ نہیں۔ میں نے عرض کیا۔ ضرور جاؤنگا۔ بگڑ کر بولے کہ عرض
ورض نہیں۔ بس شرط یہ ہے۔ کہ اسی وقت جائیے۔ اور
سیدھے وہیں جائیے گا۔ احمد بخش خاں بھی انداز دیکھ کر
خاموش ہوئے اور اُٹھ کر چلے۔ اُنہوں نے فرمایا کہ وہیں
جانا۔ اور مجھے پریشان تو کیا ہے۔ ذرا پھرتے ہوئے ادھر کو
ہی آنا۔ اُستاد کہتے تھے وہ تو گئے۔ مگر ان کو دیکھتا ہوں کہ
چپ اور چہرہ پر اضطراب کوئی دو ہی گھڑی ہوئی تھی۔ ابھی
میں بیٹھا غزل بنا رہا ہوں کہ دیکھتا ہوں۔ نواب سامنے
سے چلے آتے ہیں۔ خوش خوش۔ لبوں پر تبسم۔ آکر سلام کیا۔

اور بیٹھ گئے۔ اُنہوں نے دیکھتے ہی کہا۔ کیوں صاحب؟
نواب بولے گیا تھا۔ وہ اطلاع پاتے ہی خود نکل آئے۔
اور پوچھا ہیں نواب! اس وقت خلاف عادت؟ میں
نے کہا۔ بھئی میں نے سُنا۔ تم نے حکم دیا ہے کہ جو ہم سے ملے
بُرھ کو ملے۔ ابھی میں نے تقریر تمام بھی نہ کی تھی۔ کہ وہ بولے
نہیں نہیں نواب صاحب! آپ کے واسطے یہ حکم نہیں آپ
اُن لوگوں میں نہیں ہیں۔ آپ جس وقت چاہیں چلے آئیں
میں نے کہا۔ بھائی تم جانتے ہو۔ ریاست کے جھگڑے میں
خفقانی دیوانہ۔ کوئی بات کہنی ہے۔ کوئی سُننی ہے۔ بس میرے
کام تو بند ہوئے۔ بھائی میں تو رُخصت کو آیا تھا۔ کہ فیروزپور
چلا جاؤنگا۔ اب یہاں رہ کر کیا کروں۔ اُنہوں نے پھر وہی
کلمات ادا کئے اور کہا۔ دن رات۔ دن رات۔ جیسا جی چاہے
میں نے کہا خیر تو خاطر جمع ہوگئی۔ اب میں جاتا ہوں۔ الٰہی بخش
خاں مرحوم بھی شگفتہ ہوگئے اور کہا بس اب جائیے۔ آرام کیجئے۔
آزاد جو خُدا کے لئے دُنیا کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ خُدا بھی
اُنہیں نہیں چھوڑتا۔

استاد ذوق

ذوقؔ کی قوّتِ حافظہ

صانع قدرت جنہیں صاحبِ کمال کرتا ہے۔ انہیں اکثر صفتیں دیتا ہے۔ جن میں وہ ابنائے جنس سے صاف الگ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ذوقؔ کی تیزیٔ ذہن اور براقیٔ طبع کا حال تو اب بھی اُن کے کلام سے ثابت ہے۔ مگر قوتِ حافظہ کے باب میں ایک ماجرا عالمِ شیر خواری کا اُنہوں نے بیان کیا ہے جسے سُن کر سب تعجب کریںگے۔ کہتے تھے مجھے اب تک یاد ہے کہ اس عالم میں ایک دن مجھے بخار تھا۔ والدہ نے پلنگ پر لٹا کر لحاف اُڑھا دیا۔ اور آپ کسی کام کو چلی گئیں۔ ایک بلّی لحاف میں گھُس آئی۔ مجھے اُس سے اور اُس کی خُرخُر کی آواز سے نہایت تکلیف معلوم ہونے لگی۔ لیکن نہ ہاتھ سے ہٹا سکتا تھا۔ نہ زبان سے پکار سکتا تھا۔ گھبراتا تھا اور روتا تھا۔ تھوڑی دیر میں والدہ آگئیں۔ اُنہوں نے اُسے ہٹایا تو مجھے غنیمت معلوم ہوا۔ اور وہ دونو کیفیتیں اب تک یاد ہیں۔ چنانچہ میں جب بڑا ہوا تو میں نے والدہ

سے پُوچھا۔ اُنہوں نے یاد کرکے اس واقعہ کی تصدیق کی اور کہا کہ فی الحقیقت اس وقت تیری عمر برس دن سے کچھ کم تھی۔

خوفِ خُدا

ذوقؔ کی عادت تھی کہ ٹہلتے بہت تھے۔ دروازہ کے آگے لمبی گلی تھی۔ اکثر اس میں پھرا کرتے تھے۔ رات کیوقت ٹہلتے ٹہلتے آئے اور کہنے لگے کہ میاں ابھی ایک سانپ گلی میں چلا جاتا تھا۔ حافظ غلام رسول ویران شاگرد رشید بھی بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ حضرت پھر آپ نے اُسے مارا نہیں ہ کسی کو آواز دی ہوتی۔ فرمایا کہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا۔ مگر پھر میں نے کہا کہ ابراہیم آخر یہ بھی تو جان رکھتا ہے۔ مجھے کے رکعت کا ثواب ہوگا۔ پھر یہ قطعہ پڑھا ؎

چہ خوش گفت فردوسیؔ پاک زاد که رحمت برآں تربتِ پاک باد

میازار مورے که دانہ کش است که جان دارد و جانِ شیریں خوش است

خوفِ خدا میں لطیفہ

ایک دفعہ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ قطب میں تھے۔ یہ ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے۔ اس وقت قصیدہ لکھ رہے تھے۔ نصف شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت چڑیاں سایہ بان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں اور ان کے تنکے جو گرتے تھے۔ انہیں لینے کو بار بار ان کے آس پاس آ بیٹھتی تھیں۔ یہ عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا سر پہ آن بیٹھی۔ انہوں نے ہاتھ سے اڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی۔ انہوں نے پھر اڑا دیا۔ جب کئی دفعہ ایسا ہوا۔ تو ہنس کر کہا کہ اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے۔ ایک طرف میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف حافظ ویران بیٹھے تھے۔ وہ نابینا ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ حضرت کیا؟ میں نے حال بیان کیا۔ ویران بولے کہ ہمارے سر پہ تو نہیں بیٹھتی۔ استاد نے کہا کہ بیٹھے کیونکر؟ جانتی ہے کہ یہ ملا ہے۔ عالم ہے۔ حافظ ہے۔ ابھی

بسم اللہ۔ اللہ اکبر کر دے گا۔ دیوانی ہے؟ جو تمہارے سر پہ آتے۔

ذوق کی قناعت

ان کی طبیعت کو خدائے تعالیٰ نے شعر سے ایسی مناسبت دی تھی۔ کہ رات دن اس کے سوا کچھ خیال نہ تھا۔ اور اسی میں خوش تھے۔ ایک تنگ و تاریک مکان تھا۔ جس کی انگنائی اس قدر تھی کہ ایک چھوٹی سی چارپائی ایک طرف بچھتی تھی۔ دو طرف اتنا راستہ رہتا تھا۔ کہ ایک آدمی چل سکے۔ حقہ منہ سے لگا رہتا تھا۔ کھرّی چارپائی پر بیٹھے رہتے تھے۔ لکھے جاتے تھے۔ یا کتاب دیکھے جاتے تھے۔ گرمی۔ جاڑا۔ برسات تینوں موسموں کی بہاریں وہیں بیٹھے گزر جاتی تھیں۔ انہیں کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ کوئی میلہ کوئی عید اور کوئی موسم بلکہ دنیا کے شادی و غم سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ جہاں اوّل روز بیٹھے وہیں بیٹھے

اور جبھی اُٹھے۔ کہ دُنیا سے اُٹھے ؎

دیوانِ ذوق اور ہنگامۂ غدر

دفعتہً ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا۔ کسی کا کسی کو ہوش نہ رہا۔ میرا یہ حال ہوا کہ فتحیاب لشکر کے بہادر دفعتاً گھر میں گھس آئے۔ اور بندوقیں دکھائیں۔ کہ جلد یہاں سے نکلو۔ دُنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا ہُوا گھر سامنے تھا۔ اور میں حیران کھڑا تھا۔ کہ کیا کیا کچھ اُٹھا کر لے چلوں۔ ان کی غزلوں کے جُنگ پر نظر پڑی یہی خیال آیا۔ کہ محمد حسین! اگر خُدا نے کرم کیا۔ اور زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائیگا۔ مگر اُستاد کہاں سے پیدا ہونگے۔ جو یہ غزلیں پھر آ کر کہیں گے۔ اب ان کے نام کی زندگی ہے۔ اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں۔ تو وُہ مر کر بھی زندہ ہیں۔ یہ گئیں تو نام بھی نہ رہے گا وہی جُنگ اُٹھا بغل میں مارا سجے سجائے گھر کو چھوڑ ۲۲ نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا۔ ساتھ ہی زباں سے نکلا

کہ حضرت آدم بہشت سے نکلے تھے۔ دلّی بھی ایک بہشت ہے۔ انہی کا پوتا ہوں۔ دہلی سے کیوں نہ نکلوں۔ غرض میں آوارہ ہو کر خدا جانے کہاں کا کہاں نکل آیا ؞

ذوقؔ کی حاضر جوابی

ایک دن معمولی دربار تھا۔ اُستاد ذوقؔ بھی حاضر تھے۔ ایک مرشدزادے تشریف لائے۔ وہ شاید کسی اور مرشدزادی کی یا بیگمات میں سے کسی بیگم صاحب کی طرف سے کچھ عرض لے کر آئے تھے۔ اُنہوں نے آہستہ آہستہ بادشاہ سے کچھ کہا اور رُخصت ہوئے۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی موجود تھے اُنہوں نے عرض کی صاحب عالم! اسقدر جلدی؟ یہ آنا کیا تھا۔ اور تشریف لے جانا کیا تھا۔ صاحب عالم کی زبان سے اس وقت نکلا کہ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے۔ بادشاہ نے اُستاد کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ اُستاد! دیکھنا کیا صاف مصرع ہوا ہے۔ اُستاد نے بے توقف عرض کی کہ حضور ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے!

یہ آخر عمر کی غزل ہے۔ اس کے دو تین ہی برس بعد انتقال کیا۔

خدا کی جب نہیں چوری

رمضان کا مہینہ تھا۔ گرمی کی شدّت۔ عصر کا وقت۔ نوکر نے شربت نیلوفر کٹورے میں گھول کر کوٹھے پر تیار کیا۔ اور اُستاد ذوق سے کہا کہ ذرا اوپر تشریف لے چلئے۔ چونکہ ذوق اس وقت کچھ لکھوا رہے تھے۔ مصروفیت کے سبب سے نہ سمجھے اور سبب پوچھا۔ اس نے اشارہ کیا۔ فرمایا کہ لے آ یہیں۔ یہ ہمارے یار ہیں۔ ان سے کیا چھپانا۔ جب اس نے کٹورا لا کر دیا۔ تو یہ مطلع کہا کہ فی البدیہہ واقع ہوا تھا۔

پلا مے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری   خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

محبوب علی خاں خواجہ سرا سرکار بادشاہی میں مختار تھے۔ اور کیا محل کیا دربار دونوں جگہ اختیار قطعی رکھتے تھے۔ مگر بشدت جوا کھیلتے تھے۔ کسی بات پر ناخوشی ہوئی۔ میاں صاحب نے حج کا ارادہ کیا۔ ایک دن میں اُستاد ذوق کے پاس بیٹھا تھا کہ کسی شخص نے آکر کہا۔ میاں صاحب کعبۃ اللہ جاتے ہیں۔ آپ ذرا تامل کرکے مسکرائے اور یہ مطلع پڑھا ؂

جو دل قمار خانہ میں بُت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

دیوان چندو لال نے اِن کا کلام سُن کر مصرعِ طرح بھیجا اور بلا بھیجا۔ آپ نے غزل کہہ کر بھیجی اور مقطع میں لکھا ؂

آج کل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دِلّی کی گلیاں چھوڑ کر

اُنہوں نے خلعت اور پانسو روپے بھیجے۔ مگر یہ نہ گئے۔ ایک دن مَیں نے نہ جانے کا سبب پُوچھا فرمایا۔

نقل۔ کوئی مُسافر دِلّی میں مہینہ بیس دن رہ کر چلا۔ یہاں ایک کُتّا ہل گیا تھا۔ وُہ وفا کا مارا ساتھ ہو لیا۔ شاہدرہ پہنچکر دلّی یاد آئی۔ اور رہ گیا۔ وہاں کے کُتّوں کو دیکھا کہ نہیں فربہ۔ بدن تیار۔ چکنی چکنی پشم۔ ایک کُتّا انہیں دیکھ کر خوش ہوا اور دلّی کا سمجھ کر بہت خاطر کی۔ حلوائیوں کے بازار میں لے گیا۔ حلوائی کی دوکان سے ایک بالُو اڑا کر سامنے رکھا۔ بھٹیارہ کی دوکان سے ایک کلّہ جھپٹا۔ یہ ضیافتیں کھاتے اور دِلّی کی باتیں سُناتے رہے۔ تیسرے دن رُخصت مانگی۔ اس نے روکا۔ اُنہوں نے دِلّی کے سیر تماشے اور خوبیوں کے ذکر کئے۔ آخر چلے اور دوست کو بھی دلّی آنے کی تاکید کر آئے۔ اُسے بھی خیال رہا۔ اور ایک دن دِلّی کا رُخ کیا۔ پہلے ہی مرگھٹ کے کُتّے مردار خوار خُونی آنکھیں۔ کالے کالے مُنہ نظر آئے۔ یہ لڑتے بھڑتے نکلے۔ دریا ملا۔ دیر تک کنارہ پہ پھرے۔ آخر کُود پڑے۔ مرکھپ کر

پار پہنچے - شام ہو گئی تھی - شہر میں گلی کوچوں کے کتوں سے بچ بچا کر ڈیڑھ پہر رات گئی تھی - جس دوست سے ملاقات ہوئی یہ بیچارے اپنی حالت پر شرماتے بظاہر خوش ہوتے اور کہا۔ اوہو اس وقت تم کہاں - دل میں کہتے تھے - کہ رات نے پردہ رکھا - ورنہ دن کو یہاں کیا دھرا تھا۔ اسے لے کر ادھر ادھر پھرنے لگے - یہ چاندنی چوک ہے - یہ دریبہ ہے - جامع مسجد ہے - مہمان نے کہا۔ یار بھوک کے مارے جان نکلی جاتی ہے - سیر ہو جائے گی کچھ کھلواؤ تو سہی - انہوں نے کہا عجب وقت تم آئے ہو - اب کیا کروں - بارے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جانی کبابی مرچوں کی ہانڈی بھول گئے تھے - انہوں نے کہا لو یار بڑے قسمت والے ہو - وہ دن بھر کا بھوکا تھا - منہ پھاڑ کر گرا - اور ساتھ ہی منہ سے مغز تک گویا باروت اڑ گئی - چھینک کر پیچھے ہٹا اور جل کر کہا - واہ یہی دلّی! انہوں نے کہا اس چٹخارے ہی کے مارے تو پڑے ہیں

حافظ ویران کہتے ہیں - ایک دن عجیب تماشا ہوا - استاد ذوق

بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے مطلع ہُوا کہ ؎

ابرو کی اُس کے بات ذرا چل کے تھم گئی

تلوار آج ماہ لقا چل کے تھم گئی۔

دو تین شعر ہوئے تھے کہ خلیفہ اسمٰعیل دربار سے پھر کر آئے۔ اور کہا کہ اس وقت عجیب معرکہ دیکھا۔ اُستاد مرحوم متوجہ ہوئے۔ اُنہوں نے کہا کہ جب میں بھوانی شنکر کے چھتّے کے پاس پہنچا تو کھاری باؤلی کے رُخ پر دیکھا کہ دو تین آدمی کھڑے ہیں۔ اور آپس میں تکرار کر رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں ایسی بگڑی کہ تلوار کھنچ گئی۔ اور دو تین آدمی زخمی بھی ہوئے یہاں چونکہ غزل کے شعر حافظ ویران سُن رہے تھے۔ ہنس کر بولے کہ حضرت آپ کیا وہاں موجوُد تھے۔ آہستہ سے فرمایا کہ یہیں بیٹھے بیٹھے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ انہیں کرامات تھی۔ یا وہ غیب دان تھے۔ ایک حُسنِ اتفاق تھا۔ اہل ذوق کے لُطف طبع کے لئے لکھ دیا۔ اِس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک دن حضور میں غزل ہوئی جس کا مطلع تھا ؎

آج ابرو کی ترے تصویر کھنچ کر رہ گئی

سُنتے ہیں بھوپال میں شمشیر کھنچ کر رہ گئی

پھر معلوم ہوا کہ اسی دن بھوپال میں تلوار چلی تھی۔ ایسے معاملے کتب تاریخ اور تذکروں میں اکثر منقول ہیں۔ طول کلام کے خیال سے قلم انداز کرتا ہوں۔

ایک دفعہ دوپہر کا وقت تھا۔ باتیں کرتے کرتے سو گئے آنکھ کھلی تو فرمایا کہ ۔ ابھی خواب میں دیکھا ہے کہ کہیں آگ لگی ہے ۔

اتنے میں خلیفہ صاحب آئے اور کہا کہ پیر بخش سوداگر کی کوٹھی میں آگ لگی تھی۔ بڑی خیر ہوئی۔ کچھ نقصان نہیں ہوا ۔

زبان کا خراب کرنا

استاد ذوق فرماتے تھے۔ کہ ایک دن بادشاہ نے غزل کا مسودہ دیا اور فرمایا کہ اسے ابھی درست کرکے دے جانا۔ موسم برسات کا تھا۔ ابر آرہا تھا۔ دریا چڑھاؤ پہ تھا۔ میں دیوانِ خاص میں جاکر اسی رخ پر ایک گوشہ میں بیٹھ گیا۔ اور غزل کہنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی

دیکھا تو پشت پر ایک صاحب دانائے فرنگ کھڑے ہیں۔ مجھ
سے کہا آپ کیا لکھتا ہے ؟ میں نے کہا غزل ہے۔ پوچھا آپ
کون ہے ؟ میں نے کہا کہ نظم میں حضور کی دعا گوئی کیا کرتا ہوں۔
فرمایا کس زبان میں ؟ میں نے کہا اردو میں۔ پوچھا آپ کیا کیا
زبانیں جانتا ہے؟ میں نے کہا فارسی و عربی جانتا ہوں فرمایا
اُن زبانوں میں بھی کہنا ہے۔ میں نے کہا کوئی خاص موقع ہو تو
اُس میں بھی کہنا پڑتا ہے۔ ورنہ اردو ہی میں کہتا ہوں کہ یہ میری
اپنی زبان ہے۔ جو کچھ انسان اپنی زبان میں کر سکتا ہے۔ غیر کی
زبان میں نہیں کر سکتا۔ پوچھا آپ انگریزی جانتا ہے ؟ میں
نے کہا نہیں۔ فرمایا کیوں نہیں پڑھا۔ میں نے کہا کہ ہمارا
لب و لہجہ اُس سے موافق نہیں۔ وہ ہمیں آتی نہیں ہے۔ صاحب
نے کہا۔ وَل یہ کیا بات ہے۔ دیکھئے ہم آپ کا زبان بولتے
ہیں۔ میں نے کہا پختہ سالی میں غیر زبان نہیں آسکتی۔ بہت
مشکل معاملہ ہے۔ اُنھوں نے پھر کہا وَل ہم آپ کی تین زبان
ہندوستان میں آکر سیکھا۔ آپ ہمارا ایک زبان نہیں سیکھ
سکتے۔ یہ کیا بات ہے ؟ اور تقریر کو طول دیا۔ میں نے کہا
صاحب ہم زبان کا سیکھنا اُسے کہتے ہیں۔ کہ اُس میں بات

چیت، ہر قسم کی تحریر۔ تقریر اس طرح کریں۔ جس طرح خود اہل زبان کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔ اَم آپ کا تین زبان سیکھ لیا۔ بھلا یہ کیا زبان ہے۔ اور کیا سیکھنا ہے؟ اِسے زبان کا سیکھنا اور بولنا نہیں کہتے۔ اِسے تو زبان کا خراب کرنا کہتے ہیں ٭

ایک شخص عبدالرحمن نام پوُرب کی طرف سے دِلّی میں آئے اور حکیم آغا جان عیش کے پاس ایک مکان میں مکتب تھا۔ اُس میں لڑکے پڑھانے لگے۔ حکیم صاحب کے خویش و اقارب میں سے بھی بعض لڑکے وہاں پڑھتے تھے۔ ان میں ایک لڑکا سکندر نامہ پڑھا کرتا تھا۔ حکیم صاحب کا معمول تھا۔ آٹھویں۔ ساتویں دن رات کو ہر ایک لڑکے کا سبق سُنا کرتے تھے۔ سکندر نامہ کا سبق جو سُنا تو عجائب و غرائب مضامین سُننے میں آئے۔ فرمایا کہ اپنے مولوی کو کسی وقت

ہمارے پاس بھیجا۔ وہ دوسرے دن ہی تشریف لائے۔ حکیم صاحب آخر حکیم تھے۔ ملاقات ہوئی۔ تو اوّل قیافہ سے پھر گفتگو سے نبض دیکھی۔ معلوم ہوا کہ شُدبُد سے زیادہ مادّہ نہیں۔ مگر یہ طرفہ معجون انسان تھوڑی سی ترکیب میں رونق محفل ہو سکتا ہے۔ پوچھا کہ آپ کچھ شعر کا بھی شوق رکھتے ہیں؟ مولوی صاحب نے کہا۔ کہ کیا مشکل بات ہے! ہو سکتا ہے۔ حکیم صاحب نے کہا کہ ایک جگہ مشاعرہ ہونا ہے۔ ۸-۹ دن باقی ہیں۔ یہ طرح کا مصرع ہے۔ آپ بھی غزل کہیئے۔ تو مشاعرہ میں لے چلیں۔ وہ مشاعرہ کو بھی نہ جانتے تھے۔ اس کی صورت بیان کی۔ مولوی صاحب نے کہا کہ اس عرصہ میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ غزل کہہ کر لائے۔ سبحان اللہ اور مولوی صاحب ہی تخلص رکھا۔ حکیم صاحب کی طبع ظریف کے مشغلہ کو ایسا اُلّو خدا دے۔ بہت تعریف کی۔ غزل کو جا بجا اصلاحیں دیکر خوب لون مرچ چھڑکا۔ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے۔ یہ دیکھ کر حکیم صاحب کو اطمینان ہوا۔ مولوی صاحب کی چُگی ڈاڑھی۔ اس پر لمبی اور نکیلی۔ سر مُنڈا ہوا۔ اس پہ تکّو عمامہ۔ ففظ کھٹ بڑھئی نظر آتے تھے۔ حکیم صاحب نے کہا کہ شعرا کو

تخلّص بھی ایسا چاہیئے۔ کہ ظریفانہ و لطیفانہ ہو۔ اور خوشنما ہو۔ اور شان و شکوہ کی عظمت سے تاجدار ہو۔ بہتر ہے کہ آپ ہُدہُد تخلّص کریں۔ حضرت سُلیمان کا رازدار تھا۔ اور قاصد خجستہ کام تھا۔ وغیرہ وغیرہ چنیں و چناں مولوی صاحب نے بہت خوشی سے منظور فرمالیا۔

مشاعرہ کے دن جلسہ میں گئے۔ جب ان کے سامنے شمع آئی۔ تو حکیم صاحب نے تعریف میں چند فقرہ مناسب وقت فرمائے۔ سب متوجہ ہوئے۔ جب اُنہوں نے غزل پڑھی تو تمسخر نے تالیاں بجائیں۔ ظرافت نے ٹوپیاں اُچھالیں۔ اور قہقہوں نے اتنا شور و غُل مچایا کہ کسی غزل پر اتنی تعریف کا جوش نہ ہُوا تھا۔ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے۔ چند روز اس طرح مشاعرہ کو اور بعض امراء کے جلسوں کو رونق دیتے رہے۔ مگر مکتب کے کام سے جاتے رہے۔ حکیم صاحب نے سوچا کہ ان کے گزارہ کے لئے کوئی نسخہ ضرور تجویز کرنا چاہیئے ان سے کہا کہ بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ کہو تو تمہیں ایک دن دربار میں لے چلیں۔ دیکھو رزّاق مطلق کیا سامان کرتا ہے۔ قصیدہ تیار ہُوا اور حکیم صاحب نے ہُدہُد کو اُڑا کر دربار

میں پہنچا دیا۔ افسوس کہ اب نہیں مل سکتا ہم شعر یاد ہیں مشتے نمونہ از خروارے۔ تحفہ احباب کرتا ہوں۔

جو تیری مدح میں میں چونچ اپنی وا کر دوں
تو رشک باغ ارم اپنا گھونسلا کر دوں
جو آکے ریز کرے میرے آگے موسیقار
تو ایسے کان مروڑوں کہ بے سُرا کر دوں
جو سرکشی کرے آگے مرے ہُما آکر
تو اُس کے نوچ کے پر شکلِ پینولا کر دوں
میں کھانے والا ہوں نعمت کا اور میرے لئے
فلک کہے ہے مقرر میں با جرا کر دوں

بادشاہوں اور امیروں کو مسخراپن بلکہ زمانہ کی طبیعت کو غذا موافق ہے۔ ظفر تو خود شاعر تھے۔ خرچ عطا فرمایا۔ طائر الاراکین۔ شہپر الملک۔ ہُدہُد الشعرا۔ منقار جنگ بہادر اور سات روپیہ مہینہ کر دیا۔ کہ ان کی شاعری کی بنیاد قائم ہو گئی۔ پھر تو سر پر لمبے لمبے بال ہو گئے۔ ان میں چنبیلی کا تیل پڑنے لگا۔ اور ڈاڑھی دو شاخہ ہو کر کانوں سے باتیں کرنے لگی۔ ایک برس برسات نے ان کا مکان گرا دیا۔ گھونسلے

کی تلاش میں بھٹکتے پھرے۔ مکان ہاتھ نہ آیا۔ حکیم صاحب سے شکایت کی۔ فرمایا۔ کہ بادشاہی مکانات شہر میں بہتیرے پڑے ہیں۔ کیا ہُد ہُد کے گھونسلے کو بھی ان میں جگہ نہ ملے گی۔ دیکھو بندوبست کرتے ہیں۔ جھٹ عرضی موزوں ہوئی۔ چند متفرق شعر اس کے یاد ہیں ؎

جز ترے شاہنشہا کہہ کس کے آگے روئیے
کس سے کہئے جاکے یہ غم کو ہمارے کھوئیے

تجھ کو ہے حق نے کیا ملکِ سخن کا شہسوار
ہیں بجا کرنے سمند طبع کو بال پوئیے

حیف آتا ہے کہ فن شعر میں کیوں کھوئی عمر
کاشکے ہم سیکھتے اس سے بنانے بوریئے

تنگ لاخ ایسی زمیں ہے سوچ اے دل تا کجا
فکر کیجے صرف اس میں اور سپھر ڈھوئیے

رشتہ عمر شہنشاہِ جہاں ہووے دراز
یا خدا کھلنے رہیں دُنیا میں جب تک موئیے

دیجئے اس کو بھی زمیں تھوڑی کہ بن گھر گھونسلے
مارتا پھرتا ترا ہُد ہُد ہے ٹامک ٹوئیے

ایک سال سرکارشاہی کو تنخواہ میں دیر لگی۔ ہُدہُد نے حکیم صاحب سے شکایت کی۔ یہاں جس طرح امراضِ شکم کے لئے علاج تھے۔ اسی طرح بھوک کے تدارک کا بھی نسخہ تیار رہتا ایک قطعہ راجہ دیپی سنگھ کی مدح میں تیار ہوا کہ انہی دنوں میں خانسامانی کی تنخواہ اُنہیں سپرد ہوئی تھی۔ ۴ شعر اسوقت یاد ہیں وہی لکھتا ہوں ؎

جہاں میں آج دیپی سنگھ تو راجوں کا راجہ ہے
خُدا کا فضل ہے جو قلعہ میں تو آ براجا ہے
سلیماں نے ہے تیرے ہاتھ میں دی رزق کی کنجی
تو سرداروں کا سردار اور مہاراجوں کا راجہ ہے
شکم اہلِ جہاں کے سب ہیں شکرانے بجا لاتے
دمامہ تیرا جا کر گنبدِ گردوں پہ باجا ہے۔
کسی کو دے نہ دے تنخواہ تو مختار ہے اس کا
مگر ہُدہُد کو دیدے کیوں یہی ہُدہُد کا کھاجا ہے

حکیم صاحب ہمیشہ فکر سخن میں رہتے تھے۔ اس میں جو ظرافت کے مضامین خیال میں آتے۔ اُنہیں موزوں کرکے ہُدہُد کی چونچ میں دے دیتے۔ وہ ان کے بلکہ دو چار جانوروں کے لئے بھی

بہت تھے۔ چند شعر یاد ہیں۔ تفریح طبع کے لئے لکھتا ہوں رُباعی
ہُدہُد کا مذاق ہے نرالا سب سے انداز ہے ایک نیا نکالا سب سے
سرِ دفترِ لشکرِ سلیماں ہے یہ اُڑتا بھی ہے دیکھو بالا بالا سب سے
راست آئینوں کو لغزت ہے کج آئینوں سے
تیر نکلا جو کماں سے تو گریزاں نکلا
آشیاں ملے جو غزل پڑھنے کو ہدہد آیا۔
غل پڑا پیشِ رو ملک سلیماں آیا
حکیم صاحب کے اشارے پر ہدہد بلبلانِ سخن کو ٹھونگیں بھی مارتا تھا۔ چنانچہ بعض غزلیں سرِ مشاعرہ پڑھتا تھا۔ جس کے الفاظ نہایت شستہ اور رنگیں لیکن شعر بالکل بے معنی۔ اور کہہ دیتا تھا۔ کہ یہ غالب کے انداز میں غزل لکھی ہے۔
ایک مطلع یاد ہے ؎
مرکزِ محورِ گردوں بہ لبِ آب نہیں
ناخنِ قوسِ قزح شبہۂ مضراب نہیں
غالب مرحوم تو بہتے دریا تھے۔ سُنتے تھے اور ہنستے تھے۔ مومن خاں وغیرہ نے ہدہد کے شکار کو ایک باز تیار کیا۔ اُنہوں نے اس کے بھی پر نوچے۔ مشاعرے میں خوب خوب

چھٹے ہوئے۔ مگر اس کے شعر مشہور نہیں ہوتے۔ ہُد ہُد کا کوئی شعر یاد ہے۔ پہلا مطلع بھول گیا ؎

جسے کہتے ہیں ہُد ہُد وہ تو نر شیروں کا دادا ہے
مقابل تیرے کیا ہو۔ تو تو اِک جُرّہ کی مادہ ہے

گر اب کے بازری میدان میں آئی سامنے میرے
تو دُم میں پَر نہ چھوڑونگا یہی میرا ارادہ ہے

مفر باز جو اپنا تخلص ہے کیا تو نے
ہُوا معلوم یہ اس سے کہ گھر تیرا کشادہ ہے

ادب اے بے ادب ابتک نہیں تجھ کو خبر اسکی
کہ ہُد ہُد سب جہاں کے طائروں کا پیرزادہ ہے

چند روز بعد باز اُڑ گیا۔ یاروں نے ایک کوّا نیار کیا۔ زاغ تخلص رکھا۔ اُنھوں نے اسکی بھی خوب خبر لی۔ وہ بھی چند روز میں آندھی کا کوّا ہو کر غائب غلّا ہو گیا۔

جون آیا ہے بدل اب کے عدو کوّے کی
اس کی ہے پاؤں سے تا سر وہی خو کوّے کی

پہلے جانا تھا یہی سب نے کہ کوّا ہوگا
پھر یہ معلوم کیا۔ ہے یہ بہو کوّے کی

وہی کاں کاں وہی کیں کیں وہی ٹاں ٹاں اسکی
بات چھوڑی نہیں ہاں اک سرمو کوّے کی
بن کے کوّا جو یہ آیا ہے تو اے ہُد ہُد شاہ
دُم کترو دینے کو کچھ کم نہیں لو کوّے کی

جو جانور ہُد ہُد کے مقابل ہوتے تھے۔ انہیں استقلال نہ تھا چند روز میں ہوا ہو جاتے تھے۔ کیونکہ پالنے والوں کی طبیعتوں میں استقلال اور مادّہ نہ تھا۔ ہمیشہ ان کے ڈھب کی غزل کہہ کر مشغلہ جاری رکھنا اور مشاعرہ کی غزل کا حسب حال تیار کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کے آذوقہ کو استقلال نہ تھا۔ اُن کا آذوقہ سرکار شاہی سے تو مقرر ہی تھا۔ اور ادھر ادھر سے چرچگ کر جو برد مار لاتے تھے وہ اُن کی چاٹ تھی ۔

مرزا غالب

۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انگلشیہ کو دہلی کالج کا انتظام ازسرِنو

منظور ہوا۔ ٹامسن صاحب جو کئی سال تک اضلاع شمال و مغرب
کے لفٹنٹ گورنر بھی رہے۔ اُس وقت سکرٹری تھے۔ وہ مدرسین
کے امتحان کے لئے دہلی آئے۔ اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ
مہینے کا ایک مدرس عربی کا ہے۔ ویسا ہی ایک فارسی کا بھی ہو۔
لوگوں نے چند کاملوں کے نام بتائے۔ اُن میں مرزا غالب کا
نام بھی آیا۔ مرزا صاحب حسب الطلب تشریف لائے۔ صاحب
کو اطلاع ہوئی۔ مگر یہ پالکی سے اُتر کر اس انتظار میں ٹھہرے
کہ حسب دستور قدیم صاحب سکرٹری استقبال کو تشریف
لائیں گے۔ جبکہ نہ وہ اُدھر سے آئے۔ نہ یہ اِدھر سے گئے
اور دیر ہوئی تو صاحب سکرٹری نے جمعدار سے پوچھا۔ وہ
پھر باہر آیا۔ کہ آپ کیوں نہیں چلتے۔ انہوں نے کہا کہ صاحب
استقبال کو تشریف نہیں لائے ہیں۔ کیونکر جاتا۔ جمعدار نے جاکر
پھر عرض کی۔ صاحب باہر آئے۔ اور کہا جب آپ دربار گورنری
میں بہ حیثیت ریاست تشریف لائیں گے۔ تو آپ کی وہ تعظیم ہوگی
لیکن اس وقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں۔ اُس تعظیم کے مستحق
نہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی خدمت باعث زیادتی
اعزاز سمجھتا ہوں۔ نہ یہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں

صاحب نے فرمایا کہ ہم آئین سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب رخصت ہوکر چلے آتے ۔

غالب اور ذوق کے معرکے

نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ مرزا جواں بخت اُن کے بیٹے تھے۔ اور باوجودیکہ بہت مرشدزادوں سے چھوٹے تھے۔ مگر بادشاہ انہی کی ولیعہدی کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ جب اُن کی شادی کا موقع آیا۔ تو بڑی دھوم کے سامان ہوئے۔ مرزا نے یہ سہرا کہہ کر حضور میں گزرانا۔

سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا | باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے | ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ　　مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی　　ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کئے ہونگے موتی　　تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دُولہا کے جو گرمی سے پسینا ٹپکا　　ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اِک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے　　رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز　　چاہیئے پھُولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے　　گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رُخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک　　کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار　　لائیگا تابِ گرانباریِ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

مقطع کو سُن کر حضور کو خیال ہُوا کہ اس میں ہم پر چشمک ہے۔ گویا اس کے معنے یہ ہوئے کہ اس سہرے کے برابر کوئی سہرا کہنے والا نہیں۔ ہم نے جو شیخ ابراہیم ذوق کو اُستاد اور ملک الشعرا بنایا ہے۔ یہ سخن فہمی سے بعید ہے بلکہ طرفداری ہے۔ چنانچہ اسی دن اُستاد مرحوم جو حسبِ معمول حضور میں گئے۔ تو بادشاہ نے وہ سہرا دیا۔ کہ اُستاد دیکھئے۔ اُنہوں نے پڑھا اور بموجب عادت

کے عرض کی پیر و مرشد درست۔ بادشاہ نے کہا کہ اُستاد! تم
بھی ایک سہرا کہہ دو۔ عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی لکھ
دو اور ذرا مقطع پر بھی نظر رکھنا۔ اُستاد مرحوم وہیں بیٹھ گئے
اور عرض کیا۔

سہرا

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پہ سہرا — آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک — کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حُسن سے مانندِ شعاعِ خورشید — رُخِ پُر نور پہ ہے تیرے منوّر سہرا

وہ کہے صَلِّ علیٰ یہ کہے سُبحان اللہ — دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تا بنی اور بنے میں رہے اخلاص بہم — گوندھئے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی — گائیں مرغانِ نوا سنج نہ کیونکر سہرا

روئے فرّخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار — تار بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش — سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

ایک گوہر بھی نہیں صدفِ کانِ گہر میں چھوڑا — تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار — اللہ اللہ رے پھولوں کا معطّر سہرا

سر پہ طُرّہ ہے مزیّن تو گلے میں بدّھی — کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو منہ پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہِ خورشید فلک — کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اُٹھا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے　　دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا
دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا　　واسطے تیرے ترا ذوقِ ثنا گر سہرا

جس کو دعوٰے ہے سخن کا یہ سنا دے اُس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اربابِ نشاط حضور میں ملازم تھیں۔ اُسی وقت انہیں ملا۔ شام تک شہر کی گلی گلی کوچہ کوچہ میں پھیل گیا۔ دوسرے ہی دن اخباروں میں مشتہر ہو گیا۔ مرزا بھی بڑے ادا شناس اور سخن فہم تھے۔ سمجھے کہ تھا کچھ اور ہو گیا کچھ اور یہ قطعہ حضور میں گزرانا۔

قطعہ در معذرت

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی　　اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری　　کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل　　ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں　　مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال　　یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر　　سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ۔ ہاں اس سے مدعا　　جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہ امتثالِ امر | دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات | مقصود اُس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ | سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں | ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

فاقہ مستی

ایک دفعہ مرزاؔ بہت قرضدار ہو گئے۔ قرض خواہوں نے نالش کر دی۔ جوابدہی میں طلب ہوئے۔ مفتی صاحب کی عدالت تھی۔ جس وقت پیشی ہوئی۔ یہ شعر پڑھا ؎

قرض کی پیتے تھے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں!
رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا صاحب کو ایک آفت ناگہانی کے سبب سے چند روز جیل خانہ میں اس طرح رہنا پڑا کہ جیسے حضرت یوسفؑ کو

زندان مصر میں۔ کپڑے میلے ہو گئے۔ جوئیں پڑ گئی تھیں۔ ایکدن بیٹھے
اُن میں سے جوئیں چن رہے تھے۔ ایک رئیس وہیں عیادت کو پہنچے
پوچھا کہ کیا حال ہے۔ آپ نے یہ شعر پڑھا ؂

ہم غمزدہ جس دن سے گرفتارِ بلا ہیں	کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جس دن وہاں سے نکلنے لگے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا۔ تو
وہاں کا کُرتہ وہیں پھاڑ کر پھینکا۔ اور یہ شعر پڑھا ؂

ہائے اُس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ	جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

بدیہہ گوئی

حسین علی خاں چھوٹا لڑکا ایک دن کھیلتا کھیلتا آیا کہ داداجان
مٹھائی منگادو۔ آپ نے فرمایا کہ پیسے نہیں۔ وہ صندوقچہ کھول کر
اِدھر اُدھر پیسے ٹٹولنے لگا۔ آپ نے فرمایا ؂

درم و دام اپنے پاس کہاں	چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟

بیا برادر

مولوی فضل حق صاحب مرزا کے بڑے دوست تھے۔ ایک دن

مرزا اُن کی ملاقات کو گئے۔ اُن کی عادت تھی کہ جب کوئی بے تکلف دست آیا کرتا۔ تو خالق باری کا مصرع پڑھا کرتے تھے۔ ع۔ بیا برادر آوئرے بھائی چنانچہ مرزا صاحب کی تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہی مصرع کہہ کر بٹھایا۔ ابھی بیٹھے ہی تھے۔ کہ مولوی صاحب کی رنڈی بھی دوسرے دالان سے اُٹھ کر پاس آن بیٹھی مرزا نے فرمایا۔ ہاں صاحب اب وہ دُوسرا مصرع بھی فرما دیجئے۔ ع۔ بنشیں مادر بیٹھ ری مائی۔

گدھے کی لات

مرزا کی قاطع برہان کے بہت شخصوں نے جواب لکھے ہیں اور بہت زباں درازیاں کی ہیں۔ کسی نے کہا کہ حضرت آپ نے فلاں شخص کی کتاب کا جواب نہ لکھا۔ فرمایا بھائی اگر کوئی گدھا تمہارے لات مارے تو تم اُس کا کیا جواب دو گے؟

بہن بیمار تھیں۔ مرزا عیادت کو گئے۔ پوچھا کیا حال ہے۔ وہ بولیں کہ مرتی ہوں۔ قرض کی فکر ہے کہ گردن پر لئے جاتی ہوں۔ آپ

نے کہا کہ بُوا! بھلا یہ کیا فکر ہے؟ خُدا کے ہاں کیا مفتی صدر الدین خان بیٹھے ہیں جو ڈگری کر کے پکڑوا بُلائیں گے۔

مرزا کے پیپل کی پیپلیاں

ایک دن مرزا کے شاگرد رشید نے آ کر کہا کہ حضرت آج میں امیر خسروؒ کی قبر پر گیا۔ مزار پر کھرنی کا درخت ہے۔ اس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں۔ کھرنیوں کا کھانا تھا۔ کہ گویا فصاحت و بلاغت کا دروازہ کھُل گیا۔ دیکھئے تو میں کیا فصیح ہو گیا۔ مرزا نے کہا کہ ارے میاں تین کوس کیوں گئے؟ میرے پچھواڑے کے پیپل کی پیپلیاں کیوں نہ کھا لیں۔ چودہ طبق روشن ہو جاتے۔

ستم ظریفی

غدر کے چند روز بعد پنڈت موتی لعل کہ ان دنوں میں مترجم گورنمنٹ پنجاب کے تھے۔ صاحب کمشنر پنجاب کے ساتھ دِلّی گئے اور حب الوطن اور محبّت فن کے سبب سے مرزا صاحب کی ملاقات کی اُن دِنوں میں پنشن بند تھی۔ دربار کی اجازت نہ تھی۔ مرزا بہ سبب دلشکستگی

کے شکوہ و شکایت سے لبریز ہو رہے تھے۔ اثنائے گفتگو میں کہنے لگے۔ کہ عمر بھر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر۔ اور ایک دفعہ بھی نماز پڑھی تو مسلمان نہیں۔ پھر میں نہیں جانتا کہ مجھے سرکار نے باغی مسلمانوں میں کس طرح شامل سمجھا۔

دھوکے میں نجات

بھوپال سے ایک شخص دِلّی کی سیر کو آئے۔ مرزا صاحب کے بھی مشتاقِ ملاقات تھے۔ چنانچہ ایک دن ملنے کو تشریف لائے۔ وضع سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ نہایت پرہیزگار اور پارسا شخص ہیں۔ اُن سے باکمال اخلاق پیش آئے۔ مگر معمولی وقت تھا بیٹھے سرور کر رہے تھے۔ گلاس اور شراب کا شیشہ آگے رکھا تھا۔ اُن بیچارہ کو خبر نہ تھی کہ آپ کو یہ شوق بھی ہے۔ انہوں نے کسی شربت کا شیشہ خیال کر کے ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ کوئی شخص پاس سے بولا کہ جناب یہ شراب ہے۔ بھوپالی صاحب نے جھٹ شیشہ ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور کہا کہ میں نے تو شربت کے دھوکہ میں اُٹھایا تھا۔ مرزا نے مسکرا کر اُن کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ زہے نصیب دھوکے میں نجات ہو گئی۔

خدا کا بے مشورہ کام

ایک دفعہ رات کو انگنائی میں بیٹھے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ مرزا آسمان کو دیکھ کر فرمانے لگے۔ کہ جو کام بے صلاح و مشورہ ہوتا ہے۔ بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ خدا نے ستارے آسمان پر کسی سے مشورہ کر کے نہیں بنائے۔ جبھی بکھرے ہوئے ہیں۔ نہ کوئی سلسلہ نہ زنجیر نہ بیل نہ بوٹا ؂

سنّی مسلمان

ایک مولوی صاحب جن کا مذہب سنت و الجماعت تھا۔ رمضان کے دنوں میں ملاقات کو آئے۔ عصر کی نماز ہو چکی تھی۔ مرزا نے خدمتگار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے کہا۔ حضرت غضب کرتے ہیں۔ رمضان میں روزے نہیں رکھتے۔ مرزا نے کہا سنّی مسلمان ہوں۔ چار گھڑی دن سے روزہ کھول لیا کرتا ہوں ؂

شیطان غالب ہے

رمضان کا مہینہ تھا۔ مرزا نواب حسین مرزا کے ہاں بیٹھے تھے۔ پان منگا کر کھایا۔ ایک صاحب فرشتہ سیرت نہایت متقی و پرہیزگار اُس وقت حاضر تھے۔ اُنہوں نے متعجب ہو کر پُوچھا کہ قبلہ آپ روزہ نہیں رکھتے۔ مُسکرا کر بولے شیطان غالب ہے!

یہ لطیفہ اہل ظرافت میں پہلے سے بھی مشہور ہے۔ کہ عالمگیر کا مزاج سرمد سے مکدر تھا۔ اس لئے ہمیشہ اس کا خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ قاضی قوی جو اس عہد میں قاضیٔ شہر تھا۔ اس لے ایک موقع پر سرمد کو بھنگ پیتے ہوئے جا پکڑا اول بہت سے لطائف و ظرائف کے ساتھ جواب سوال ہوئے۔ آخر جب قاضی نے کہا کہ نہیں! شرع کا حکم اسی طرح ہے۔ کیوں حکم الٰہی کے برخلاف باتیں بناتا ہے۔ اُس نے کہا کہ کیا کروں۔ بابا شیطان قوی ہے ✣

جاڑے میں بھی توبہ

جاڑے کا موسم تھا۔ ایک دن نواب مصطفیٰ خان صاحب
مرزا کے گھر آئے۔ آپ نے ان کے آگے شراب کا گلاس
بھر کر رکھ دیا۔ وہ ان کا مُنہ دیکھنے لگے۔ آپ نے فرمایا
کہ لیجئے چونکہ وہ تائب ہو چکے تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ
میں نے تو توبہ کی۔ آپ متعجب ہو کر بولے کہ ہیں کیا
جاڑے میں بھی ؟

شراب پینے کی تاویل

ایک صاحب نے اُن کے سُنانے کو کہا کہ شراب
پینی سخت گناہ ہے۔ آپ نے ہنس کر کہا کہ بھلا جو پیے
تو کیا ہوتا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ ادنیٰ بات یہ ہے
کہ دعا نہیں قبول ہوتی۔ مرزا نے کہا کہ آپ جانتے ہیں

شراب پیتا کون ہے؟ اوّل تو وہ کہ ایک بوتل اولڈٹام کی۔ باسامان سامنے حاضر ہو۔ دوسرے بے فکری۔ تیسرے صحت۔ آپ فرمایئے کہ جسے یہ سب کچھ حاصل ہو اُسے اور چاہیئے کیا۔ جس کے لئے دُعا کرے؟

مرزا دبیر اور ناسخ

مرزا دبیر

شاگردانِ الٰہی کی طبیعت بھی جذبہ الٰہی کا جوش رکھتی ہے۔ بچپن سے دبیر کا دل چونچال تھا۔ ابتدائے مشق میں کسی لفظ پر اُستاد کی اصلاح پسند نہ آئی۔ شیخ ناسخ زندہ تھے۔ مگر بوڑھے ہو گئے تھے۔ اُن کے پاس چلے گئے۔ وہ اُس وقت گھر کے صحن میں مونڈھے بچھائے جلسہ جمائے بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے عرض کی کہ حضرت! اِس شعر میں مَیں نے تو یہ کہا ہے اور اُستاد نے یہ اصلاح دی ہے۔ اُنہوں نے فرمایا کہ اُستاد نے ٹھیک اصلاح دی ہے۔ اُنہوں نے پھر کہا کہ حضرت کتابوں میں تو اِس

طرح آیا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ نہیں جو تمہارے اُستاد نے بنایا ہے۔ وہی درست ہے۔ اُنہوں نے پھر وہی عرض کی کہ حضرت آپ کتاب کو ملاحظہ تو فرمائیں۔ شیخ صاحب نے جھنجھلا کر کہا ارے تو کتاب کو کیا جانے! ہمارے سامنے کتاب کا نام لیتا ہے۔ ہم کتابیں دیکھتے دیکھتے خود کتاب بن گئے ہیں۔ ایسے غصے ہوئے کہ لکڑی سامنے رکھی تھی وہ لے کر اُٹھے یہ بھاگے۔ اُنہیں بھی ایسا جوش تھا۔ کہ دروازہ تک ان کا تعاقب کیا۔

(شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم پرنٹر چھپوا کر شائع کیا)

فلسفہ الٰہیات مولانا کے وہ حکیمانہ جذبات جو عربی فارسی اور سنسکرت سے اخذ کئے اور حالت بیخودی میں اردو کے انداز میں تحریر فرمائے۔ قیمت ۔ عه

آبِ حیات مشہور شعرائے اردو کی سوانحعمری اور زبان مذکور کی عہد بعہد ترقیوں اور اصلاحوں کا بیان ہے یا دوسرے لفظوں میں مشرقی شاعری کی آخری بہار کا افسانہ ہے۔ جس کا ایک ایک لفظ دل میں رکھ لینے کے قابل ہے۔ سائز ۲۶×۲۰ صفحات ۵۵۲ قیمت تین روپیہ ۔ سے

سیرِ ایران مشرقی زبانوں کے محقق نے ہندوستان اور پنجاب سے نکل کر ایران اور افغانستان تک تحقیق کا دامن بچھایا تھا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد اپنے سفر کے حالات مولینا نے خود بیان فرمائے ہیں جس کا لفظ لفظ دلچسپی کے رس سے بھرا پڑا ہے۔ اس مختصر سے لیکچر میں رائی سے لے کر پربت تک سب پر روشنی ڈالی ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ۔ عه

تذکرہ علما ہندوستان کے چالیس مشاہیر علما کا تذکرہ ۔ قیمت صرف پانچ آنے ۔ ۵ر

نظم آزاد ۔ قیمت صرف ۸ر

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ ۔ لاہور

مجموعہ مکتوبات آزاد — مخزن والوں نے ایک دفعہ مولانا کے چند خطوط اپنے ہاں چھپوائے تھے جنکی سادگی اور دلچسپی پر لوگ ہزار جان سے عاشق ہوگئے۔ اب نہایت کوشش سے سینکڑوں خط جمع کئے ہیں۔ دلبستگی اور مطلب کی ادائگی خود طرز تحریر کے قربان ہوجاتی ہے۔ عہ

دیوان ذوق — مغل شہنشاہی کے آخری چراغ ابوظفر محمد بہادر شاہ کے استاد ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمۃ کا کلام اور تمام قصیدے جس قدر بہم پہنچ سکے اور دیباچہ میں سوانحعمری یہ کتاب آبحیات کے بعد مشرقی بہار کا دوسرا افسانہ ہے ایک ایک لفظ کہیں موتی اور کہیں آنسو کی جھلک مارتا ہے۔ قیمت - عہ/۲

لغت آزاد — فارسی کی لغت جس میں اردو کو لغت قرار دیکر فارسی میں اس کے روزمرہ با محاورہ معانی بیان کئے ہیں ترجمہ کرنیوالے حضرات کے لئے تو ہر وقت پاس رکھنا نہایت لازمی ہے تقطیع ۲۲×۱۸ حجم ۱۶۴ صفحہ لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت - عہ

قند فارسی قیمت - ۱۰/ - **آموزگار فارسی** قیمت - ۱۲/
نصیحت کا کرن پھول - ۸/ - **سپاک نماک** - ۱۰/

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ - لاہور

از شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم پرنٹر چھپوا کر شائع کیا